شیعہ جواب دیتے ہیں

سید رضا حسینی نسب

مترجم: عمران مہدی

مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

فہرست مطالب

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت و ظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچے و کلیاں رنگ و نکھار پیدا کرلیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ و راہ اجالوں سے پرنور ہوجاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت و قابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔ اسلام کے مبلغ و موسس سرور کائنات حضرت محمد مصطفی [ص] غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم و آگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمۂ حق و حقیقت سے سیراب کردیا، آپ کے تمام الٰہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمراں ایران و روم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑگئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت و عمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذہبِ عقل و آگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھودیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب و روایات پر غلبہ حاصل کرلیا۔ اگرچہ رسول اسلام [ص] کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیرووں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت و پاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اور ناقدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کا شکار ہوکر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کردئی گئی تھی، پھر بھی حکومت و سیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء و دانشور دنیائے اسلام کو تقدیم کئے جنھوں نے بیرونی افکار و نظریات سے متاثر اسلام و قرآن مخالف فکری و نظری موجوں کی زد پر

اپنی حق آگین تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشتپناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام و قرآن اور مکتب اہل بیت علیہم السلام کی طرف اٹھی اور گڑی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکری و معنوی قوت واقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب و کامراں زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین وبے تاب ہیں،یہ زمانہ علمی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھاکر انسانی عقل و شعور کو جذب کرنے والے افکار و نظریات دنیا تک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہل بیتؑ کونسل) مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیتؑ عصمت و طہارت کے پیرووں کے درمیان ہم فکری و یکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تاکہ موجودہ دنیائے بشریت جو قرآن و عترت کے صاف و شفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق و معنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان و ولایت سے سیراب ہوسکے، ہمیں یقین ہے عقل و خرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیتؑ عصمت و طہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوّتو رسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدو خال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق و انسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خوں خواروں کی نام نہاد تہذیب و ثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کو امن و نجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس راہ میں تمام علمی و تحقیقی کوششوں کے لئے محققین و مصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین و مترجمین کا ادنیٰ خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترویج و اشاعت کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، فاضل علاّم آقای سیدرضا حسینی نسب کی گرانقدر کتاب (شیعہ پاسخ می دھد) کو مولانا عمران مہدی نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس

کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں،اسی منزل میں ہم اپنے تمام دوستوں اور معاونین کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنیٰ جہاد رضائے مولیٰ کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

پیش گفتار

عالم اسلام کے موجودہ حالات سے باخبر حضرات یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ آج امت اسلامیہ کئی ''امتوں''میں بٹی ہوئی ہے ۔اور ہر امت خاص نظریات اور رسومات کی پابند ہے جسکے نتیجہ میں ان کی زندگی کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے کہ جن کی بقا کا راز ہی مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنے میں ہے اور وہ اپنے اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے مختلف طریقوں سے سرمایہ گزاری کرتے ہیں اور اس کیلئے ہر ممکن وسیلے کو بروئے کار لاتے ہیں ۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلامی فرقوں کے درمیان چند اختلافی مسائل ضرور پائے جاتے ہیں اگرچہ ان اختلافی مسائل کا تعلق علم کلام کے ایسے مسائل سے ہے جن کے موجد خود اسلامی متکلمین ہیں اور مسلمانوں کی اکثریت ان سے آگاہ تک نہیں ہے۔اور یہ بالکل طے شدہ بات ہے کہ مسلمانوں کے درمیان ان اختلافی مسائل سے کہیں زیادہ اہم ، مشترک نکات بھی پائے جاتے ہیں کہ جنھوں نے انہیں ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے لیکن اختلاف ڈالنے والے افراد ،اصول اور فروع میں موجود ان مشترک نکات کو چھوڑ کر صرف اختلافی مسائل کو ہی بیان کرتے ہیں ۔

''اتحاد بین المسلمین''کی ایک کانفرنس میں انفرادی مسائل (جیسے نکاح، طلاق اور میراث وغیرہ ہیں) سے متعلق اسلامی مذاہب کے فقہی نظریات کا بیان میرے سپرد کیا گیا تھا چنانچہ میں نے اس کانفرنس میں ان موضوعات کے متعلق ایک تحقیقی رسالہ پیش کیا کہ جس نے تمام شرکاء کو تعجب میں ڈال دیا اس رسالہ کے مطالعہ سے پہلے کسی کے لئے ہرگز یہ بات قابل قبول نہ تھی کہ فقہ شیعہ ان تینوں موضوعات کے اکثر مسائل میں اہل سنت کے موجودہ چاروں مذاہب سے موافقت رکھتی ہے ۔

یہ اختلاف ڈالنے والے افراد ، شیعوں کو دوسرے اسلامی فرقوں سے جدا سمجھتے ہیں اور شب و روز اپنے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اس مظلوم فرقے کے خلاف سرگرم عمل ہیں ۔ یہ لوگ اپنے ان کاموں کے ذریعہ اپنے مشترکہ دشمن کی خدمت کررہے ہیں ان ناآگاہ

افراد کو میری یہ نصیحت ہے کہ وہ شیعوں سے بھائی چارے ، اور ان کے علماء اور دانشوروں سے رابطے کے ذریعہ اپنی آنکھوں سے ناآگاہی کے پردے ہٹا دیں اور شیعوں کو اپنا دینی بھائی سمجھیں اور اس طرح وہ قرآن مجید کی درج ذیل آیت کے مصداق قرار پائیں: (إِنَّ هٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ) استعمار کے پرانے حربوں میں سے ایک حربہ مسلمانوں کے درمیان طرح طرح کے شبہات اور اعتراضات پیدا کرنا رہا ہے تاکہ وہ اس طرح ایران کے اسلامی انقلاب کو نقصان پہنچا سکیں اور یہ وہ پرانا حربہ ہے جو آخری چند صدیوں میں مشرق وسطیٰ اور دوسرے علاقوں میں مختلف صورتوں میں رائج رہا ہے حج کے موقع پر بہت سے حجاج کرام اسلامی انقلاب سے آشنائی حاصل کرتے ہیں مگر دوسری طرف سے دشمنوں کی غلط تبلیغات ان کے اذہان کو تشویش میں مبتلا کر دیتی ہیں اور وہ حجاج جب ایرانی حجاج سے ملتے ہیں تو ان سے ان سوالات کے جوابات کا مطالبہ کرتے ہیں ۔

آپ کے ہاتھوں میں موجود یہ کتاب دینی اور ثقافتی مسائل سے متعلق انہی سوالوں کا جواب دینے کی خاطر تحریر کی گئی ہے ۔ اس کتاب کو میری نگرانی میں محترم جناب سید رضا حسینی نسب نے ان سوالوں کا جواب دینے کے لئے منظم انداز سے تحریر کیا ہے ۔ البتہ اختصار کی خاطر ضرورت کے مطابق مختصر جوابات ہی پیش کئے گئے ہیں مزید تفصیلات کسی اور مقام پر پیش کی جائیں گی ۔ امید ہے کہ یہ ناچیز خدمت امام زمانہ (ارواحنالہ الفداء) کی بارگاہ میں مورد قبول قرار پائے گی ۔

جعفر سبحانی

حوزۂ علمیہ قم

۲۲ نومبر ۱۹۹۴ء

پہلا سوال

''وعترتی اہل بیتی '' صحیح ہے یا ''وسنتی''؟حدیث ثقلین ایک بے حد مشہور حدیث ہے جسے محدثین نے اپنی کتابوں میں ان دو طریقوں سے نقل کیا ہے: الف: ''کتاب اللہ و عترتي أہل بیتي''ب: ''کتاب اللہ وسنتي''اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دو میں سے کونسی حدیث صحیح ہے؟

جواب:پیغمبر اسلام[ص]سے جو حدیث صحیح اور معتبر طریقے سے نقل ہوئی ہے اس میں لفظ ''اہل بیتی ''آیا ہے.اور وہ روایت جس میں ''اہل بیتی''کی جگہ ''سنتی''آیا ہے وہ سند کے اعتبار سے باطل اور ناقابل قبول ہے ہاں جس حدیث میں ''واہل بیتی'' ہے اس کی سند مکمل طور پر صحیح ہے۔حدیث ''واہل بیتی''کی سند اس مضمون کی حدیث کو دو بزرگ محدثوں نے نقل کیا ہے: ا۔ مسلم ،اپنی صحیح میں زید بن ارقم سے نقل کرتے ہیں: ایک دن پیغمبر اکرمؐ نے ایک ایسے تالاب کے کنارے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس کا نام ''خم'' تھا یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع تھا اس خطبے میں آپؐ نے خداوندکریم کی حمدو ثنا کے بعد لوگوں کو نصیحت فرمائی اور یوں فرمایا '': ألا أیہا الناس، فانما أنا بشر یوشک أن یأتي رسول ربي فأجیب وأنا تارک فیکم الثقلین. أولھا کتاب اللہ فیہ الھدی والنور، فخذوا کتاب اللہ واستمسکوا بہ، فحث علی کتاب اللہ ورغب فیہ ثم قال: وأہل بیتي أذکرکم اللہ في أہل بیتي. أذکرکم اللہ في أہل بیتي. أذکرکم اللہ في أہل بیتي[1].''اے لوگو!بے شک میں ایک بشر ہوں اور قریب ہے کہ میرے پروردگار کا بھیجا ہوا نمائندہ آئے اور میں اس کی دعوت قبول کروں میں تمہارے درمیان دو وزنی چیزیں چھوڑے جارہا ہوں ایک کتاب خدا ہے جس میں ہدایت اور نور ہے کتاب خدا کو لے لو اور اسے تھامے رکھو اور پھر پیغمبر اسلامؐ نے کتاب خدا پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی اور اس کی جانب رغبت دلائی اس کے بعد یوں فرمایا اور دوسرے میرے اہل بیتؑ ہیں. اپنے اہل بیت کے سلسلے میں،میں تمہیں خدا کی یاد دلاتا ہوں اور اس جملے کی تین مرتبہ تکرار فرمائی.اس حدیث کے متن کو دارمی نے بھی اپنی کتاب سنن[2] میں نقل کیا ہے. پس کہنا چاہئے کہ حدیث

[1] صحیح مسلم جلد۴ ص۱۸۰۳حدیث نمبر ۲۴۰۸طبع عبدالباقی
[2] سنن دارمی جلد۲ ص ۴۳۱،۴۳۲

ثقلین کے مذکورہ فقرے کیلئے یہ دونوں ہی سندیں روز روشن کی طرح واضح ہیں اور ان میں کوئی خدشہ نہیں ہے. ۲۔ ترمذی نے اس حدیث کے متن کو لفظ ''عترتی اھل بیتی'' کے ساتھ نقل کیا ہے : متنِ حدیث اس طرح ہے'':إنّي تارک فيكم ما إن تمسكتم به لن تضلوا بعدي، أحدهما أعظم من اآخر : كتاب الله حبل ممدود من السماء إلى الأرض و عترتي أهل بيتي، لن يفترقا حتى يردا عليَّ الحوض فانظروا كيف تخلفوني فيهما[1]''میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک تم ان سے متمسک رہوگے ہرگز گمراہ نہ ہوگے، ان دو چیزوں میں سے ایک دوسری سے بڑی ہے، کتاب خدا ایک ایسی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک آویزاں ہے اور دوسرے میرے اہل بیت ہیں. اور یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں .لہذا یہ دیکھنا کہ تم میرے بعد ان کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرتے ہو. صحیح کے مؤلف مسلم اور سنن کے مؤلف ترمذی نے لفظ ''اہل بیتی'' پر زور دیا ہے اور یہی مطلب ہمارے نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے یہی نہیں بلکہ ان کی نقل کردہ سندیں پوری طرح سے قابل اعتماد اور خصوصی طور پر معتبر مانی گئی ہیں.

لفظ ''و سنتی'' والی حدیث کی سندوہ روایت کہ جس میں لفظ ''اہل بیتی''کی جگہ ''سنتی'' آیا ہے جعلی ہے. اس کی سند ضعیف ہے اور اسے اموی حکومت کے درباریوں نے گھڑا ہے. ۱۔ حاکم نیشا پوری نے اپنی کتاب مستدرک میں مذکورہ مضمون کو ذیل کی سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے''.عباس بن أبي أويس'' عن ''أبي أويس'' عن ''ثور بن زيد الديلمي''عن ''عكرمه'' عن ''ابن عباس'' قال رسول الله : ''يا أيّها الناس إنّي قد تركت فيكم ،إن اعتصمتم به فلن تضلوا أبداً كتاب الله و سنة نبيه''.اے لوگو! میں نے تمہارے درمیان دو چیزوں کو چھوڑا ہے اگر تم نے ان دونوں کو تھامے رکھا تو ہر گز گمراہ نہ ہوگے . اور وہ کتاب خدا اور سنت پیغمبرؐ ہیں[2]. اس حدیث کے اس مضمون کے راویوں کے درمیان ایک ایسے باپ بیٹے ہیں جو سند کی دنیا میں آفت شمار ہوتے ہیں وہ باپ بیٹے اسماعیل بن ابی اویس اور ابو اویس ہیں کسی نے بھی ان کے موثق ہونے کی شہادت نہیں دی ہے بلکہ ان کے بارے میں یہ

---

[1] سنن ترمذی جلد۵ص۶۶۳نمبر ۳۷۷۸۸

[2] حاکم مستدرک جلدنمبر ۱ ص۹۳

مشہور ہے کہ یہ دونوں جھوٹے اور حدیثیں گھڑنے والے تھے.ان دو کے بارے میں علمائے رجال کا نظریہ حافظ مزی نے اپنی کتاب تہذیب الکمال میں اسماعیل اور اس کے باپ کے بارے میں علم رجال کے محققین کا نظریہ اس طرح نقل کیا ہے: یحییٰ بن معین (جن کا شمار علم رجال کے بزرگ علماء میں ہوتا ہے) کہتے ہیں کہ ابو اویس اور ان کا بیٹا دونوں ہی ضعیف ہیں. اسی طرح یحییٰ بن معین سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ کہتے تھے کہ یہ دونوں حدیث کے چور تھے۔ ابن معین سے بھی اسی طرح منقول ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ابو اویس کے بیٹے پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا.ابو اویس کے بیٹے کے بارے میں نسائی کہتے تھے کہ وہ ضعیف اور ناقابل اعتماد ہے. ابوالقاسم لالکائی نے لکھا ہے کہ ''نسائی'' نے اس کے خلاف بہت سی باتیں کہی ہیں اور یہاں تک کہا ہے کہ اس کی حدیثوں کو چھوڑ دیا جائے.

ابن عدی (جو کہ علماء رجال میں سے ہیں) کہتے ہیں کہ ابن ابی اویس نے اپنے ماموں مالک سے ایسی عجیب و غریب روایتیں نقل کی ہیں جن کو ماننے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں ہے ابن حجر اپنی کتاب فتح الباری کے مقدمہ میں لکھتے ہیں، ابن ابی اویس کی حدیث سے ہر گز حجت قائم نہیں کی جا سکتی، چونکہ نسائی نے اس کی مذمت کی ہے.[۲] حافظ سید احمد بن صدیق اپنی کتاب فتح الملک العلی میں سلمہ بن شیب سے اسماعیل بن ابی اویس کے بارے میں نقل کرتے ہیں، سلمہ بن شیب کہتے ہیں کہ میں نے خود اسماعیل بن ابی اویس سے سنا ہے کہ وہ کہہ رہا تھا : جب میں یہ دیکھتا کہ مدینہ والے کسی مسئلے میں اختلاف کر کے دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں تو اس وقت میں حدیث گھڑ لیتا تھا[۳].

اس اعتبار سے اسماعیل بن ابی اویس کا جرم یہ ہے کہ وہ حدیثیں گھڑتا تھا ابن معین نے کہا ہے کہ وہ جھوٹا تھا اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کی حدیث کو نہ تو صحیح مسلم نے نقل کیا ہے اور نہ ہی ترمذی نے ،اور نہ ہی دوسری کتب صحاح میں اس کی حدیث کو نقل کیا گیا ہے .اور اسی طرح ابو اویس کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ ابو حاتم رازی نے اپنی کتاب ''جرح و تعدیل'' میں اس کے

---

[۱] حافظ مزی ، کتاب تہذیب الکمال ج ۳ ص ۱۲۷
[۲] مقدمہ فتح الباری ابن حجر عسقلانی ص ۳۹۱ طبع دار المعرفۃ
[۳] کتاب فتح الملک العلی ، حافظ سید احمد ص ۱۵

بارے میں یہ لکھا ہے کہ ابو اویس کی حدیثیں کتابوں میں لکھی تو جاتی ہیں مگر ان سے حجت قائم نہیں کی جاسکتی کیونکہ اس کی حدیثیں قوی اور محکم نہیں ہیں اسی طرح ابو حاتم نے ابن معین سے نقل کیا ہے کہ ابو اویس قابل اعتماد نہیں ہے.جب وہ روایت صحیح نہیں ہوسکتی جس کی سند میں یہ دو افراد ہوں تو پھر اس روایت کا کیا حال ہوگا جو ایک صحیح اور قابل عمل روایت کی مخالف ہو. یہاں پر قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس حدیث کے ناقل حاکم نیشاپوری نے خود اس حدیث کے ضعیف ہونے کا اعتراف کیا ہے اسی وجہ سے انہوں نے اس حدیث کی سند کی تصحیح نہیں کی ہے لیکن اس حدیث کے صحیح ہونے کے لئے ایک گواہ لائے ہیں جو خود سند کے اعتبار سے کمزور اور ناقابل اعتبار ہے اسی وجہ سے یہ شاہد حدیث کو تقویت دینے کے بجائے اس کو اور ضعیف بنا رہا ہے اب ہم یہاں ان کے لائے ہوئے فضول گواہ کو درج ذیل عنوان کی صورت میں ذکر کرتے ہیں:حدیث ''وسنتی'' کی دوسری سند حاکم نیشاپوری نے اس حدیث کو ابو ہریرہ سے مرفوع [2]طریقہ سے ایک ایسی سند کے ساتھ جسے ہم بعد میں پیش کریں گے یوں نقل کیا ہے:إني قد ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعدھما : کتاب اللّٰہ و سنتي و لن یفترقا حتی یردا عليّ الحوض[3].اس متن کو حاکم نیشاپوری نے درج ذیل سلسلہ سند کے ساتھ نقل کیا ہے'':الضبي'' عن ''صالح بن موسیٰ الطلحي'' عن ''عبدالعزیز بن رفیع'' عن ''أبي صالح'' عن ''أبي ہریرہ'' یہ حدیث بھی پہلی حدیث کی طرح جعلی ہے. اس حدیث کے سلسلہ سند میں صالح بن موسی الطلحی نامی شخص ہے جس کے بارے میں ہم علم رجال کے بزرگ علماء کے نظریات کو یہاں بیان کرتے ہیں: یحییٰ بن معین کہتے ہیں: کہ صالح بن موسیٰ قابل اعتماد نہیں ہے. ابو حاتم رازی کہتے ہیں ۔

اس کی حدیث ضعیف اور ناقابل قبول ہے اس نے بہت سے موثق و معتبر افراد کی طرف نسبت دے کر بہت سی ناقابل قبول احادیث کو نقل کیا ہے. نسائی کہتے ہیں کہ صالح بن موسیٰ کی نقل کردہ احادیث لکھنے کے قابل نہیں ہیں، ایک اور مقام پر کہتے ہیں کہ

---

[1] الجرح والتعدیل جلد ۵ ص ۹۲ ابو حاتم رازی
[2] حدیث مرفوع: ایسی حدیث کو کہا جاتا ہے جس کی سند سے ایک یا کئی افراد حذف ہوں اور ان کی جگہ کلمہ ''رفعہ'' استعمال کردیا گیا ہوتو ایسی حدیث ضعیف ہوگی.(مترجم)
[3] حاکم مستدرک جلد ۱ ص ۹۳

اس کی نقل کردہ احادیث متروک ہیں[1]. ابن حجر اپنی کتاب ''تھذیب التھذیب'' میں لکھتے ہیں : ابن حبان کہتے ہیں : کہ صالح بن موسیٰ موثق افراد کی طرف ایسی باتوں کی نسبت دیتا ہے جو ذرا بھی ان کی باتوں سے مشابہت نہیں رکھتیں سرانجام اس کے بارے میں یوں کہتے ہیں: اس کی حدیث نہ تو دلیل بن سکتی ہے اور نہ ہی اس کی حدیث حجت ہے ابونعیم اس کے بارے میں یوں کہتے ہیں: اس کی حدیث متروک ہے۔ وہ ہمیشہ ناقابل قبول حدیثیں نقل کرتا تھا[2] اسی طرح ابن حجر اپنی کتاب تقریب[3] میں کہتے ہیں کہ اس کی حدیث متروک ہے اسی طرح ذہبی نے اپنی کتاب کاشف[4] میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ صالح بن موسیٰ کی حدیث ضعیف ہے یہاں تک کہ ذہبی نے صالح بن موسیٰ کی اسی حدیث کو اپنی کتاب ''میزان الاعتدال ''میں ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ صالح بن موسیٰ کی نقل کردہ یہ حدیث اس کی ناقابل قبول احادیث میں سے ہے[5].

حدیث ''وسنتی''کی تیسری سند ابن عبدالبر نے اپنی کتاب ''تمہید[6]''میں اس حدیث کے متن کو درج ذیل سلسلہ سند کے ساتھ نقل کیا ہے''.عبدالرحمن بن یحییٰ'' عن ''احمد بن سعید'' عن ''محمد بن ابراھیم الدبیلي'' عن ''علي بن زید الفرائضي'' عن ''الحنیني'' عن ''کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف'' عن ''أبیہ'' عن ''جدہ.''امام شافعی نے کثیر بن عبداللہ کے بارے میں کہا ہے کہ وہ جھوٹ کے ارکان میں سے ایک رکن تھا[7]۔ ابوداؤد کہتے ہیں کہ وہ بہت زیادہ جھوٹ بولنے والے افراد میں سے تھا[8].ابن حبان اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ عبداللہ بن کثیر نے حدیث کی جو کتاب اپنے باپ اور دادا سے نقل کی ہے اس کی بنیاد جعل حدیث پر ہے اس کی کتاب سے کچھ نقل کرنا اور عبداللہ بن کثیر سے روایت لینا قطعا حرام ہے صرف اس صورت میں صحیح ہے کہ اس کی بات کو تعجب کے طور پر یا تنقید کرنے کے لئے نقل کیا جائے[9].نسائی اور دارقطنی کہتے ہیں : اس کی حدیث متروک ہے امام احمد

---

[1] تہذیب الکمال جلد ۱۳ ص ۹۶ حافظ مزی.
[2] تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۳۵۵، ابن حجر
[3] ترجمہ تقریب ، نمبر ۲۸۹۱، ابن حجر
[4] ترجمہ الکاشف، نمبر ۲۴۱۲
[5] ذہبی میزان الاعتدال جلد۲ ص ۳۰۲ ذہبی
[6] التمہید، جلد ۲۴ ص ۳۳۱
[7] تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۳۷۷ (دارالفکر) اور تہذیب الکمال جلد ۲۴ ص ۱۳۸
[8] گزشتہ کتابوں سے مأخوذ
[9] المجروحین، جلد ۲ ص ۲۲۱ ابن حبان

کہتے ہیں : کہ وہ معتبر راوی نہیں ہے اور اعتماد کے لائق نہیں ہے.اسی طرح اس کے بارے میں ابن معین کا بھی یہی نظریہ ہے تعجب انگیز بات تویہ ہے کہ ابن حجر نے ''التقریب'' کے ترجمہ میں صالح بن موسیٰ کو فقط ضعیف کہنے پر اکتفاء کیا ہے اور صالح بن موسیٰ کو جھوٹا کہنے والوں کو شدت پسند قرار دیا ہے ،حالانکہ علمائے رجال نے اس کے بارے میں جھوٹا اور حدیثیں گھڑنے والا جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں یہاں تک کہ ذھبی اس کے بارے میں کہتے ہیں : اس کی باتیں باطل اور ضعیف ہیں.

سند کے بغیر متن کا نقل

امام مالک نے اسی متن کو کتاب ''الموطا'' [1] میں سند کے بغیراور بصورت مرسل [2] نقل کیا ہے جبکہ ہم سب جانتے ہیں کہ اس قسم کی حدیث کوئی حیثیت نہیں رکھتی اس تحقیق سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ حدیث جس میں ''وسنتی'' ہے وہ جعلی اور من گھڑت ہے اور اسے جھوٹے راویوں اور اموی حکومت کے درباریوں نے ''وعترتی'' کے کلمہ والی صحیح حدیث کے مقابلے میں گھڑا ہے لہذا مساجد کے خطباء ،مقررین اور ائمہ جماعت حضرات کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس حدیث کوچھوڑ دیں جو رسول [ص] نے بیان نہیں کی ہے.بلکہ اس کی جگہ صحیح حدیث سے لوگوں کو آشنا کریں.

اور وہ حدیث جسے مسلم نے اپنی کتاب ''صحیح'' میں لفظ ''و اہل بیتی'' کے ساتھ اور ترمذی نے لفظ ''عترتی و اہل بیتی'' کے ساتھ نقل کیا ہے اسے لوگوں کے سامنے بیان کریں اسی طرح علم ودانش کے متلاشی افراد کے لئے ضروری ہے کہ علم حدیث سیکھیں تاکہ صحیح اور ضعیف حدیث کو ایک دوسرے سے جدا کرسکیں.آخر میں ہم یہ یاددلا دیں کہ حدیث ثقلین میں لفظ ''اہل بیتی'' سے پیغمبر اسلامؐ کی مراد حضرت علی ـ اور وہ حضرت فاطمہ زہرا ٢٣٦، حضرت امام حسن ـ اور حضرت امام حسین ـ ہیں ـ کیونکہ مسلم نے [3] اپنی کتاب صحیح میں اور ترمذی نے [4] اپنی کتاب سنن میں حضرت عائشہ سے اس طرح نقل کیا ہے:نزلت هذه الآیة علیٰ النبي [ص].(اِنّما

---

[1] الموطا ، مالک ص ٨٨٩ حدیث ٣
[2] روایت مرسل : ایسی روایت کو کہا جاتا ہے جس کے سلسلہ سند سے کوئی راوی حذف ہو جیسے کہا جائے ''عن رجل'' یا عن بعض اصحابنا تو ایسی روایت مرسلہ ہوگی(مترجم)
[3] صحیح مسلم جلد ۴ ص ١٨٨٣ ح ٢۴٢۴
[4] ترمذی جلد ۵ ص ۶۶٣

یریدُ اللہ لیذھبَ عنکُم الرِجسَ أھلَ البیتِ و یُطھرکم تطھیراً)في بیت أم سلمة فدعا النبي[ص]فاطمة و حسناً و حسیناً فجللھم بکساء و عَليّ خلف ظھرہ فجللّہ بکساء ثم قال : أللّھم ھؤلاءِ أھل بیتي فأذ ھبعنھم الرجس و طھرھم تطھیرا. قالت أم سلمة و أنا معھم یا نبي اللہ؟ قال أنتِ علیٰ مکانک و أنتِ إلی الخیر!. یہ آیت (اِنّما یرید اللہ لیذھبَ عنکُم الرِجسَ اَھلَ البیتِ و یُطَھّرکم تطھیراً)ام سلمہ کے گھر میں نازل ہوئی ہے پیغمبر اسلامؐ نے فاطمہؑ، حسن و حسین کو اپنی عبا کے اندر لے لیا اس وقت علیؑ آنحضرتؐ کے پیچھے تھے آپ نے ان کو بھی چادر کے اندر بلا لیااور فرمایا : اے میرے پروردگار یہ میرے اہل بیت ہیں پلیدیوں کو ان سے دور رکھ اور ان کو پاک وپاکیزہ قرار دے ۔ ام سلمہ نے کہا : اے پیغمبر خداؐ کیا میں بھی ان میں سے ہوں(یعنی آیت میں جو لفظ اہل بیت آیا ہے میں بھی اس میں شامل ہوں؟)پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا تم اپنی جگہ پر ہی رہو (عبا کے نیچے مت آؤ) اور تم نیکی کے راستے پر ہو ۔ ''

حدیث ثقلین کا مفہوم

چونکہ رسول اسلام نے عترت کو قرآن کا ہم پلہ قرار دیا ہے اور دونوں کو امت کے درمیان حجت خدا قرار دیا ہے لہٰذا اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں:۱۔ قرآن کی طرح عترت رسولؐ کا کلام بھی حجت ہے اور تمام دینی امور خواہ وہ عقیدے سے متعلق ہوں یا فقہ سے متعلق ان سب میں ضروری ہے کہ ان کے کلام سے تمسک کیا جائے ،اور ان کی طرف سے دلیل و رہنمائی مل جانے کے بعد ان سے روگردانی کر کے کسی اور کی طرف نہیں جانا چاہئے ۔

پیغمبر خداؐ کی وفات کے بعد مسلمان خلافت اور امت کے سیاسی امور کی رہبری کے مسئلہ میں دو گروہوں میں بٹ گئے اور ہر گروہ اپنی بات کو حق ثابت کرنے کے لئے دلیل پیش کرنے لگا اگرچہ مسلمانوں کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے مگر اہل بیت کی علمی مرجعیت کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ سارے مسلمان حدیث ثقلین کے صحیح ہونے پر متفق ہیں اور یہ حدیث عقائد اور احکام میں قرآن اور عترت کو مرجع قرار دیتی ہے اگر امت اسلامی اس حدیث پر عمل کرتی تو اس کے درمیان اختلاف کا

[1] اقتباس از حسن بن علی السقاف صحیح صفۃ صلاۃ النبی [ص] ص ۲۹۴. ۲۸۹

دائرہ محدود اور وحدت کا دائرہ وسیع ہوجاتا.۲۔ قرآن مجید، کلام خدا ہونے کے لحاظ سے ہر قسم کی خطا اور غلطی سے محفوظ ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ اس میں خطا اور غلطی کا احتمال دیا جائے جبکہ خداوند کریم نے اس کی یوں توصیف کی ہے: (لَا یَأْتِیهِ الْبَاطِلُ مِن بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنزِیلٌ مِّنْ حَكِیمٍ حَمِیدٍ[1]) ''باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے اور یہ حکیم و حمید خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے''.اگر قرآن مجید ہر قسم کی خطا سے محفوظ ہے تو اس کے ہم رتبہ اور ہم پلہ افراد بھی ہر قسمکی خطا سے محفوظ ہیں کیونکہ یہ صحیح نہیں ہے کہ ایک یا کئی خطاکار افراد قرآن مجید کے ہم پلہ اور ہم وزن قرار پائیں۔

یہ حدیث گواہ ہے کہ وہ افراد ہر قسم کی لغزش اور خطا سے محفوظ اور معصوم ہیں البتہ یہ بات ملحوظ رہے کہ عصمت کا لازمہ نبوت نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی معصوم ہو لیکن نبی نہ ہو جیسے حضرت مریم اس آیۂ شریفہ: (إِنَّ اللّٰہَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِینَ[2]) (اے مریم !) خدا نے تمھیں چن لیا اور پاکیزہ بنادیا ہے اور عالمین کی عورتوں میں منتخب قرار دیا ہے ۔ کے مطابق گناہ سے تو پاک ہیں لیکن پیغمبر نہیں ہیں۔

---

[1] سورہ فصلت آیت ۴۲
[2] سورہ آل عمران آیت ۴۲

دوسرا سوال

شیعہ سے کیا مراد ہے؟

جواب: عربی لغت میں ''شیعہ'' کے معنی ہیں پیروی کرنے والاجیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے: (وَإِن مِن شِیعَتِہِ لَإِبْرَاہِیمَ[1]) اور یقیناان (نوح) کے پیروکاروں میں سے ابراہیم بھی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی اصطلاح میں شیعہ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے اپنی وفات سے قبل کئی موقعوں پر اپنے جانشین اور خلیفہ کا اعلان فرمایا تھا ان ہی موقعوں میں سے ایک ہجرت کے دسویں سال کی اٹھارہ ذی الحجہ کی تاریخ بھی ہے. جو روز غدیر خم کے نام سے معروف ہے اس دن آنحضرتؐ نے مسلمانوں کے ایک عظیم مجمع میں اپنے جانشین اور خلیفہ کو اپنے بعد مسلمانوں کے لئے ان کے سیاسی، علمی اور دینی امور میں مرجع قرار دیا تھا اس جواب کی مزید وضاحت یہ ہے :پیغمبراکرمؐ کے بعد مہاجرین اور انصار دو گروہوں میں بٹ گئے: ا۔ ایک گروہ کا یہ عقیدہ تھا کہ پیغمبر خدا [ص]نے مسئلہ خلافت کو یونہی نہیں چھوڑ دیا تھا بلکہ آپؐ نے اپنے جانشین کو خود معین فرمایا تھا آپؐ کے جانشین حضرت علی بن ابی طالب ۔ ہیں جو سب سے پہلے پیغمبر خداؐ پر ایمان لائے تھے۔

مہاجرین اور انصار کے اس گروہ میں بنی ہاشم کے تمام سربرآوردہ افراد اور بعض بزرگ مرتبہ صحابہ جیسے سلمان، ابوذر، مقداداور خباب بن ارت وغیرہ سرفہرست تھے مسلمانوں کا یہ گروہ اپنے اسی عقیدے پر باقی رہا، اور یہی افراد علی ۔ کے شیعہ کہلائے.البتہ یہ لقب پیغمبر خداؐ نے اپنی زندگی ہی میں امیر المومنین ۔ کے پیروکاروں کو عطا فرمایا تھا آنحضرت نے حضرت علی بن ابی طالب ۔ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :والذي نفسي بیدہ اِن ھذا و شیعتہ لھم الفائزون یوم القیامۃ[2] قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے یہ (علیؑ) اور ان کے پیروکار قیامت کے دن کامیاب ہوں گے.اس بنا پر شیعہ صدر اسلام کے مسلمانوں

---

[1] سورہ صافات آیت ۸۳

[2] تفسیر درالمنثور جلد ۶ جلال الدین سیوطی نے سورۂ بینہ کی ساتویں آیت(إِنَّ الَّذِینَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُوْلٰئِکَ ہُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ) کی تفسیر میں یہ حدیث نقل کی ہے.

کے اس گروہ کو کہا جاتا ہے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ منصب ولایت و امامت خدا کی طرف سے معین کیا جاتا ہے اس وجہ سے یہ گروہ اس نام سے مشہور ہوا اور یہ گروہ آج بھی راہ امامت پر گامزن ہے اور اہل بیت پیغمبرؐ کی پیروی کرتا ہے اس وضاحت سے شیعوں کا مرتبہ اور مقام بھی واضح ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بعض جاہل یا مفاد پرست افراد کا یہ کلام بھی باطل ہوجاتا ہے کہ شیعیت پیغمبر اکرمؐ کے بعد کی پیداوار ہے تاریخ شیعیت کی مزید اور بہتر شناخت کے لئے ''اصل الشیعہ و اصولھا'' ''المراجعات'' اور ''اعیان الشیعہ''، جیسی کتابوں کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا.

۲۔ دوسرے گروہ کا عقیدہ یہ تھا کہ منصب خلافت، انتخابی ہے اور اسی لئے انھوں نے حضرت ابوبکر کی بیعت کی اور مدتوں بعد یہی گروہ ''اہل سنت'' یا تسنن کے نام سے مشہور ہوا اور نتیجہ میں ان دو اسلامی گروہوں کے درمیان بہت سے اصولوں میں مشترک نظریات ہونے کے باوجود مسئلہ خلافت اور جانشینی پیغمبر اکرمؐ کے سلسلے میں اختلاف ہوگیا۔ واضح رہے کہ ان فرقوں کے بانی افراد مہاجرین اور انصار تھے.

تیسرا سوال

کیوں حضرت علی،ہی پیغمبرؐ کے وصی اور جانشین ہیں ؟

جواب:ہم پہلے بھی ذکر کرچکے ہیں کہ شیعوں کا راسخ عقیدہ یہ ہے کہ منصب خلافت، خدا عطا فرماتا ہے اسی طرح ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے بعد شروع ہونے والی امامت چند اعتبار سے نبوت کی طرح ہے جس طرح یہ ضروری ہے کہ پیغمبر اص کو خدا معین فرمائے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ پیغمبرؐ کے وصی کو بھی خدا ہی معین کرے اس حقیقت کے سلسلے میں حیات پیغمبر اکرم کی تاریخ بہترین گواہ ہے کیونکہ پیغمبر اکرمؐ نے چند موقعوں پر اپنا خلیفہ معین فرمایا ہے ہم یہاں ان میں سے تین موقعوں کا ذکر کرتے ہیں:۱۔ آغاز بعثت میں:جب پیغمبر اسلام کو خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اس آیہ کریمہ (وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ[1]) کے مطابق آئین توحید کی طرف دعوت دیں، تو آنحضرتؐ نے ان سب کو خطاب کرتے ہوئے یوں فرمایا ''جو بھی اس راستے میں میری مدد کرے گا ، وہی میرا وصی ، وزیر، اور جانشین ہوگا''، پیغمبر اکرمؐ کے الفاظ یہ تھے '' :فأیکم یؤازرني في هذاالأمر علی أن یکون أخي و وزیري و خلیفتي و وصیي فیکم ''،تم میں سے کون ہے جو اس کام میں میری مدد کرے تاکہ وہی تمہارے درمیان میرا بھائی، وزیر، وصی اور جانشین قرار پائے؟

اس ملکوتی آواز پر صرف اور صرف علی ابن ابی طالب ۔ نے لبیک کہا اس وقت پیغمبر اکرم نے اپنے رشتہ داروں کی طرف رخ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا '' :اِن هذا أخي و وصیي و خلیفتي فیکم فاسمعوا له و أطیعوه[2]''، بہ تحقیق یہ (علیؑ) تمہارے درمیان میرا بھائی، وصی اور جانشین ہے.اس کی باتوں کو سنو اور اس کی پیروی کرو.

---

[1] سوره شعراء آیت ۲۱۴

[2] تاریخ طبری ؛ جلد ۲ ص ۶۳. ۶۲ اور تاریخ کامل جلد ۲ ص ۴۱ ۔۴۰اور مسند احمد جلد۱ ص ۱۱۱ ، اور شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید) جلد۱۳ ص ۲۱۲. ۲۱۰

٢۔ غزوۂ تبوک میں پیغمبر خدا [ص] نے حضرت علی ۔ سے فرمایا '': أما ترضی أن تکون مني بمنزلة ہارون من موسیٰ إلا أنہ لانبي بعدي[1]'' کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ تمہاری نسبت مجھ سے ویسی ہی ہے جیسی ہارون کو موسیٰ سے تھی بجز اس کے کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا یعنی جس طرح ہارون ۔ حضرت موسیٰ ۔ کے بلا فصل وصی اور جانشین تھے، اسی طرح تم بھی میرے خلیفہ اور جانشین ہو۔

٣۔ دسویں ہجری میں رسول خدا [ص] نے حجۃالوداع سے واپس لوٹتے وقت غدیر خم کے میدان میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کے درمیان حضرت علی ۔ کو مسلمانوں اور مومنوں کا ولی معین کیا اور فرمایا '' :مَن کنت مولاہ فھذا عليٌ مولاہ'''' جس کا میں سرپرست اور صاحب اختیار تھا اب یہ علیؑ اس کے مولا اور سرپرست ہیں '' یہاں پر جو اہم اور قابل توجہ نکتہ ہے وہ یہ کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنے خطبے کے آغاز میں ارشاد فرمایا '':ألستُ أولیٰ بکم مِن أنفسکم؟'''' کیا میں تمہارے نفسوں پر تم سے بڑھ کر حق نہیں رکھتا ؟ '' اس وقت تمام مسلمانوں نے یک زبان ہوکر پیغمبر اکرمؐ کی تصدیق کی تھی لہذا یہاں پر یہ کہنا ضروری ہے کہ آنحضرتؐ کی اس حدیث کی رو سے جو برتری اور اختیار تام رسولؐ کو حاصل تھا وہی برتری و اختیار کامل علیؑ کو حاصل ہے۔

اس اعتبار سے یہاں پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح آنحضرتؐ مومنین پر برتری اور فوقیت رکھتے تھے اسی طرح حضرت علی ۔ بھی مومنین کے نفسوں پر برتری اور فوقیت رکھتے ہیں اس دن حسان بن ثابت نامی شاعر نے غدیر خم کے اس تاریخی واقعے کو اپنے اشعار میں اس طرح نظم کیا ہے: ینادیھم یوم الغدیر نبیُّھم بخم واسمع بالرسول منادیافقال فمن مولاکم و نبیُّکم ؟ فقالوا ولم یبدوا ھناک التعامیا الھک مولانا و أنت نبیُّنا ولم تلق منا في الولایة عاصیافقال لہ قم یا علي فإنني رضیتک من بعدي إماما وھادیافمن کنت مولاہ فھذا ولیہ فکونوا لہ أتباع صدق موالیاھناک دعا : اللّھم وال ولیہ وکن للذي عادیٰ علیاً معادیا[2] حدیث غدیر، اسلام کی ایسی متواتر[3] احادیث میں سے ایک

---

[1] سیرۂ ابن ہشام جلد٢ ص ٥٢٠ اور الصواعق المحرقہ طبع دوم مصر باب ٩ فصل ٢ ص ١٢١.

[2] المناقب (خوارزمی مالکی)ص ٨٠ اور تذکرۃ خواص الامہ (سبط ابن جوزی حنفی) ص ٢٠ اور کفایۃ الطالب ص ١٧ (مصنف گنجی شافعی) وغیرہ...

[3] حدیث متواتر: وہ روایت ہے جو ایسے متعدد اور مختلف راویوں سے نقل ہوئی ہو جس میں ذرا بھی جھوٹ کا شائبہ نہ رہ جائے.(مترجم)

ہے جس کو شیعہ علماء کے علاوہ تقریبا تین سو ساٹھ سنی علماء نے بھی نقل کیا ہے [1] یہاں تک کہ اس حدیث کا سلسلہ سند ایک سو دس اصحاب پیغمبرؐ تک پہنچتا ہے اور عالم اسلام کے چھبیس بزرگ علماء نے اس حدیث کے سلسلۂ سند کے بارے میں مستقل طور پر کتابیں لکھی ہیں. مشہور مسلمان مورخ ابوجعفر طبری نے اس حدیث شریف کے سلسلۂ اسناد کو دو بڑی جلدوں میں جمع کیا ہے اس سلسلے میں مزید معلومات کے لئے کتاب ''الغدیر'' کا مطالعہ کریں.

[1] بطور نمونہ کتاب ''الصواعق المحرقہ'' (ابن حجر) طبع دوم مصر باب ۹ اور فصل ۲ ص ۱۲۲ کا مطالعہ کریں.

چوتھا سوال

''ائمہ'' کون ہیں؟

جواب: پیغمبر گرامی اسلامؐ نے اپنی زندگی ہی میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ آپؐ کے بعد بارہ خلیفے ہوں گے اور سب قریش میں سے ہوں گے اور اسلام کی عزت انہیں خلفاء کی مرہون منت ہوگی.جابربن سمرہ کہتے ہیں '': سمعت رسول اللہ [ص]یقول: لایزال الإسلام عزیزاً إلی اثني عشر خلیفۃ ثم قال کلمۃ لا أسمعھا فقلت لأبي: ماقال ؟ فقال: کلھم من قریش.[1]'' میں نے پیغمبر خدا [ص]کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اسلام کو بارہ خلفاء کے ذریعہ عزت حاصل ہوگی اور پھر پیغمبر اکرمؐ نے کوئی لفظ کہا جسے میں نے نہیں سنا میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ پیغمبر اکرمؐ نے کیا فرمایاہے.جواب دیا کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ یہ سب قریش میں سے ہوں گے .

اسلام کی تاریخ میں ایسے بارہ خلفاء جو اسلام کی عزت کے محافظ اور نگہبان رہے ہوں ان بارہ اماموں کے علاوہ نہیں ملتے جن کو شیعہ اپنے امام مانتے ہیں کیونکہ جن بارہ خلفاء کا تعارف خود پیغمبر اکرمؐ نے کرایا تھا وہی آنحضرتؐ کے بلا فصل خلیفہ شمار ہوتے ہیں. اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ بارہ افراد کون ہیں؟اگر ہم ان چار خلفاء سے کہ جن کو اہل سنت خلفاء راشدین کہتے ہیں ، چشم پوشی کرلیں تو دوسرے خلفاء میں سے کوئی بھی عزت اسلام کا باعث نہیں تھاجیسا کہ اموی اور عباسی خلفاء کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے. لیکن شیعوں کے سبھی بارہ ائمہ اپنے اپنے زمانے میں تقوی اور پرہیزگاری کے پیکر تھے.وہ سب پیغمبراکرمؐ کی سنت کے محافظ تھے نیز وہ سب صحابہ کرام،تابعین اور بعد میں آنے والی نسلوں کی توجہ کا مرکز قرار پائے. مورخین نے بھی انکے علم اور ان کی وثاقت کی صاف لفظوں میں گواہی دی ہے .ان بارہ اماموں کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:١۔امام علی ابن ابی طالب ۔

٢۔امام حسن بن علی (مجتبیٰ) ۔٣۔ امام حسین بن علی ۔

٤۔ امام علی ابن الحسین (زین العابدین) ۔

---

[1] صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۲ طبع مصر

۵۔امام محمد بن علی (باقر) ۔

٦۔ امام جعفر بن محمد (صادق) ۔

۷۔ امام موسیٰ بن جعفر (کاظم) ۔

۸ ۔ امام علی بن موسیٰ (رضا) ۔

۹۔ امام محمد بن علی (تقی) ۔

۱۰۔ امام علی بن محمد (نقی) ۔

۱۱۔ امام حسن بن علی (عسکری) ۔

۱۲۔ امام مہدی (قائم) ۔

آپ کے سلسلے میں مسلمان محدثین نے پیغمبر اسلامؐ سے متواتر احادیث نقل کی ہیں کہ جن میں آپ کو مہدی موعود (جن کا وعدہ کیا گیا ہے) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔یہ وہ ائمہ معصومین ہیں کہ جنکے اسمائے مبارک پیغمبرؐ اسلام نے بیان فرمائے ہیں انکی زندگی سے متعارف ہونے کیلئے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا :۱تذکرۃ الخواص (تذکرۃ خواص الامۃ)

۲.کفایۃ الاثر

۳.وفیات الاعیان

۴.اعیان الشیعہ (سید محسن امین عاملی) یہ کتاب بقیہ کتابوں کی نسبت زیادہ جامع ہے۔

پانچواں سوال

حضرت محمد]ص[پر صلوات پڑھتے وقت کیوں آل کا اضافہ کرتے ہیں اور: اللّھم صل علی محمد و آل محمد کہتے ہیں؟

جواب: یہ ایک مسلم اور قطعی بات ہے کہ خود پیغمبر اکرمؐ نے مسلمانوں کو درود پڑھنے کا یہ طریقہ سکھایا ہے جس وقت یہ آیۂ شریفہ :إِن اللہَ وَملاَءِکَتہَ یُصَلُّون عَلَی النَّبِیِّ یاأَیُّہا الّذِین آمَنُوا صَلُّوا عَلَیہِ وَ سَلِّمُوا تَسلِیما[۱]) نازل ہوئی تو مسلمانوں نے آنحضرتؐ سے پوچھا : ہم کس طرح درود پڑھیں ؟پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: ''لاتُصلُّوا عليَّ الصلاۃ البتراء '' مجھ پر ناقص صلوات مت پڑھنا'' مسلمانوں نے پھر آنحضرتؐ سے سوال کیا :ہم کس طرح درود پڑھیں؟

پیغمبر خداؐ نے فرمایا کہو: اللّھم صلِّ علی محمد و آل محمد[۲]. اہل بیت [ع]قدر ومنزلت کے ایک ایسے عظیم درجہ پر فائز ہیں جسے امام شافعی نے اپنے ان مشہورا شعار میں قلمبند کیا ہے:یاأہل بیت رسول اللہ حبّکم فرض من اللہ في القرآن انزلہ کفاکم من عظیم القدر أنکم مَن لم یصلِّ علیکم لاصلاۃ لہ[۳] ترجمہ:اے اہل بیت پیغمبرؐ آپ کی محبت کو خدا نے قرآن میں نازل کر کے واجب قرار دے دیا ہے.آپ کی قدر و منزلت کے لئے بس یہی کافی ہے کہ جو شخص بھی آپ پر صلوات نہ پڑھے اس کی نماز ہی نہیں ہوتی.

---

[۱] سورہ احزاب آیت ۵۶

[۲] الصواعق المحرقہ (ابن حجر) طبع دوم مکتبۃ القاہرہ مصر باب ۱۱ فصل اول ص ۱۴۶ اورایسی روایت تفسیر در المنثور جلد ۵ سورہ احزاب کی آیت ۵۶ کے ذیل میں بھی موجود ہے اس روایت کو صاحب تفسیر نے محدثین اور کتب صحاح اور کتب مسانید(جیسے عبدالرزاق ، ابن ابی شبیہ، احمد ، بخاری ، مسلم، ابوداؤد ، ترمذی، نسائی ، ابن ماجہ اور ابن مردویہ) سے نقل کیا ہے ۔ مذکورہ راویوں نے کعب ابن عجرہ سے اور انہوں نے رسول خداؐ سے نقل کیا ہے.

[۳] الصواعق المحرقہ (ابن حجر) باب ۱۱ ص ۱۴۸ فصل اول اور کتاب اتحاف (شبراوی) ص ۲۹ اور کتاب مشارق الانوار (حمزاوی مالکی) ص ۸۸ اور کتاب المواہب (زرقانی) اور کتاب الاسعاف (صبان) ص ۱۹۹.

چھٹا سوال

آپ اپنے اماموں کو معصوم کیوں کہتے ہیں؟

جواب: شیعوں کے ائمہ [ع] جو کہ رسول ؐکے اہل بیت ہیں ان کی عصمت پر بہت سی دلیلیں موجود ہیں. ہم ان میں سے صرف ایک دلیل کا یہاں پر تذکرہ کرتے ہیں: شیعہ اور سنی دانشوروں نے یہ نقل کیا ہے کہ پیغمبر خداؐ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں یہ ارشاد فرمایا ہے'': اِنِي تارکٌ فیکم الثقلین کتاب اللہ و أهل بیتي و انهما لن یفترقا حتی یردا عليّ الحوض[1]۔''میں تمہارے درمیان دو وزنی چیزیں چھوڑے جارہا ہوں''کتاب خدا'' (قرآن) اور ''میرے اہل بیت'' یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں گے. یہاں پر ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ: قرآن مجید ہر قسم کے انحراف اور گمراہی سے محفوظ ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ وحیِ الہی کی طرف غلطی اور خطا کی نسبت دی جائے جبکہ قرآن کو نازل کرنے والی ذات، پروردگار عالم کی ہے اور اسے لانے والا فرشتہ وحی ہے اور اسے لینے والی شخصیت پیغمبر خداؐ کی ہے اور ان تینوں کا معصوم ہونا آفتاب کی طرح روشن ہے اسی طرح سارے مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ پیغمبر خداؐ وحی کے لینے، اس کی حفاظت کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کے سلسلے میں ہر قسم کے اشتباہ سے محفوظ تھے لھذا یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ جب کتاب خدا اس پائیدار اور محکم عصمت کے حصار میں ہے تو رسول خداؐ کے اہل بیت [ع] بھی ہر قسم کی لغزش اور خطا سے محفوظ ہیں کیونکہ حدیث ثقلین میں پیغمبر خداؐ نے اپنی عترت کو امت کی ہدایت اور رہبری کے اعتبار سے قرآن مجید کا ہم رتبہ اور ہم پلہ قرار دیا ہے.اور چونکہ عترت پیغمبرؐ اور قرآن مجید ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں لہذا یہ دونوں عصمت کے لحاظ سے بھی ایک جیسے ہیں دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ غیر معصوم فرد یا افراد کو قرآن مجید کا ہم پلہ قرار دینے کی کوئی وجہ نہ تھی.اسی طرح ائمہ معصومین [ع] کی عصمت کے سلسلے میں واضح ترین گواہ پیغمبر اکرم [ص] کا یہ جملہ ہے '': لن یفترقا حتی یردا عليّ الحوض''.یہ دو ہرگز (ہدایت اور رہبری میں) ایک

[1] مستدرک حاکم ، جزء سوم ص ۱۴۸۔اور الصواعق المحرقہ ابن حجر باب ۱۱ فصل اول ص ۱۴۹اور اسی سے ملتی جلتی روایات کنز العمال جزء اول باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ص ۴۴، اور مسند احمد جز ء پنجم ص ۱۸۹ ، ۱۸۲اور دیگر کتب میں موجود ہیں.

دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں گے.اگر پیغمبر خداؐ کے اہل بیتؑ ہر قسم کی لغزشوں سے محفوظ نہ ہوں اور ان کے لئے بعض کاموں میں خطا کا امکان پایا جاتا ہو تو وہ قرآن مجید سے جدا ہوکر (معاذاللہ) گمراہی کے راستے پر چل پڑیں گے. کیونکہ قرآن مجید میں خطا اور غلطی کا امکان نہیں ہے لیکن رسول خداؐ نے انتہائی شدت کے ساتھ اس فرضیہ کی نفی فرمائی ہے.البتہ یہ نکتہ واضح رہے کہ اس حدیث میں لفظ اہل بیت سے آنحضرتؐ کی مراد آپؐ کے تمام نسبی اور سببی رشتہ دار نہیں ہیں کیونکہ اس بات میں شک نہیں ہے کہ وہ سب کے سب لغزشوں سے محفوظ نہیں تھے.لہذا آنحضرتؐ کی عترت میں سے صرف ایک خاص گروہ اس قسم کے افتخار سے سرفراز تھا اور یہ قدر و منزلت صرف کچھ گنے چنے افراد کے لئے تھی اور یہ افراد وہی ائمہ اہل بیت[ع]ہیں جو ہر زمانے میں امت کو راہ دکھانے والے، سنت پیغمبرؐ کے محافظ اور آنحضرتؐ کی شریعت کے پاسبان تھے۔

ساتواں سوال

اذان میں أشهد أن عليًا ولي الله کیوں کہتے ہیں اور حضرت علی ـ کی ولایت کی شہادت کیوں دیتے ہیں؟

جواب: بہتر ہے کہ اس سوال کے جواب میں درج ذیل نکات کو مد نظر رکھا جائے: ۱ـ تمام شیعہ مجتہدین نے فقہ سے متعلق اپنی استدلالی یا غیر استدلالی کتابوں میں اس بات کو صراحت کیساتھ بیان کیا ہے کہ ولایت علی ـ کی شہادت اذان اور اقامت کا جزء نہیں ہے اور کسی بھی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ولایت علیؑ کی شہادت کو اذان اور اقامت کا جزء سمجھ کر زبان پر جاری کرے.

۲ـ قرآن مجید کی نگاہ میں حضرت علی ـ ولی خدا ہیں اور خداوند عالم نے اس آیت میں مومنین پر حضرت علی ـ کی ولایت کو بیان کیا ہے: (إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ[1]) ایمان والو بس تمہارا ولی اللہ ہے اس کا رسول ہے اور وہ صاحبان ایمان جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوة دیتے ہیں. اہل سنت کی صحیح اور مسند کتابوں نے بھی اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ یہ آیۂ شریفہ حضرت علی ـ کی شان میں اس وقت نازل ہوئی تھی جب آپ نے اپنی انگشتر مبارک حالت رکوع میں فقیر کو عطا کی تھی[2] جب یہ آیت حضرت امیرالمومنین ـ کی شان میں نازل ہوئی تو شاعر اہل بیت [ع] حسان بن ثابت نے اس واقعے کو اس طرح اپنے اشعار میں ڈھالا تھا: آپ وہ ہیں کہ جنہوں نے حالت رکوع میں بخشش کی اے بہترین رکوع کرنے والے آپ پر تمام قوم کی جانیں نثار ہوجائیں. خداوند کریم کی ذات نے آپ کے حق میں بہترین ولایت نازل کی ہے اور اسے شریعتوں کے خلل ناپذیر احکام میں بیان کیا ہے.

۳ـ پیغمبر گرامی اسلامؐ نے فرمایا '' إنّما الأعمال بالنيّات '' '' بے شک اعمال کا دارمدار نیتوں پر ہے ''. اس بنا پر جب '' ولایت علیؑ '' ان اصولوں میں سے ایک ہے کہ جنہیں قرآن مجید نے صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، اور دوسری طرف سے اس جملہ

---

[1] سورہ مائدہ آیت :۵۵.

[2] اس سلسلے میں کہ یہ آیۃ حضرت علی ـ کی شان میں نازل ہوئی ہے بہت سی کتابیں موجود ہیں لیکن ان تمام کتابوں کا یہاں تذکرہ ممکن نہیں ہے لیکن پھر بھی ہم ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں: ۱ـ تفسیر طبری جلد ۶ ص ۱۸۶. ۲ـ احکام القرآن (تفسیر جصاص) جلد۲ ص ۵۴۲. ۳ـ تفسیر البیضاوی جلد ۱ ص ۳۴۵. ۴ـ تفسیر الدرالمنثور جلد ۲ ص ۲۹۳.

(اشھد ان علیاً ولي اللہ) کو اذان کا جزء سمجھ کر نہ کہا جائے تو پھر ہمارے لئے رسالت پیغمبرؐ کی گواہی کے ہمراہ ولایت علیؑ کا بھی اعلان کرنے میں کیا حرج ہے ؟یہاں پرایک نکتہ کا ذکر ضروری ہے اور وہ یہ کہ اگر اذان میں کسی جملے کا اضافہ کرنا مناسب نہیں ہے اور اس کے ذریعہ شیعوں پراعتراض کیا جاتا ہے تو ذیل میں بیان ہونے والی ان دو باتوں کی کس طرح توجیہ کی جائے گی:

۱۔ معتبر تاریخ گواہ ہے کہ یہ جملہ ''حيّ علیٰ خیر العمل'' اذان کا جزء تھا[1] لیکن خلیفہ دوم نے اپنی خلافت کے زمانے میں یہ تصور کیا کہ کہیں لوگ اس جملے کو اذان میں سن کر یہ گمان نہ کر بیٹھیں کہ تمام اعمال کے درمیان صرف نماز ہی بہترین عمل ہے اور پھر جہاد پر جانا چھوڑ دیں گے لہذا اس جملے کو اذان سے حذف کردیا اور پھراور مؤطا جلد ۱ ص ۹۳ میں بھی یہ بات درج ہے.اذان اسی حالت پر باقی رہی[2].

۲۔ ''الصلاۃ خیر من النوم'' یہ جملہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں اذان کا جزء نہیں تھا بعد میں یہ جملہ اذان میں بڑھا یا گیاہے[3] اسی وجہ سے امام شافعی نے اپنی کتاب ''الامّ'' میں کہا ہے '': أکرہ في الأذان الصلاۃ خیر من النوم لأن أبا مخدورہ لم یذکرہ[4]'' اذان میں الصلوۃ خیر من النوم کہنا مجھے پسند نہیں ہے کیونکہ ابو مخدورہ (جو کہ ایک راوی اور محدث ہیں) نے اس جملے کا (اپنی حدیث میں) ذکر نہیں کیا ہے۔

---

[1] کتاب کنزالعمال، کتاب الصلوۃ جلد ۴ ص ۲۶۶ طبرانی سے منقول ہے:'' کان بلال یؤذن بالصبحفیقول : حی علی خیر العمل.''بلال جب اذان صبح دیتے تھے تو کہتے تھے حيّ علیٰ خیر العمل .اور سنن بیہقی جلد ۱ ص ۴۲۴ اور ص ۴۲۵

[2] کنزالعرفان جلد ۲ ص ۱۵۸ اور کتاب ''الصراط المستقیم'' وجواہر الاخبار والآثار اور شرح تجرید (قوشچی) ص ۴۸۴ میں ہے کہ : صعد المنبر و قال: أیهاالناس ثلاث کنّ علی عهد رسول اللّٰه أنا أنهیٰ عنهنّ و أحرمهن و أُعاقب علیهن و هي متعۃ النساء و متعۃ الحج و حيّ علیٰ خیر العمل''.

[3] کنزالعمال ، کتاب الصلوۃ جلد ۴ ص ۲۷۰

[4] دلائل الصدق جلد ۳ القسم الثانی ص ۹۷ سے ماخوذ.

آٹھواں سوال

مہدی آل محمد علیہ السلام کون ہیں اور انکا انتظار کیوں کیا جاتا ہے؟

جواب: کچھ امور ایسے ہیں جن کے سلسلے میں تمام آسمانی شریعتیں اتفاق نظر رکھتی ہیں ان میں سے ایک امر عالمی مصلح کا وجود بھی ہے جو کہ آخری زمانہ میں ظہور کرے گا اس سلسلے میں صرف مسلمان نہیں بلکہ یہودی اور عیسائی بھی اس کی آمد کے منتظر ہیں جو پوری دنیا میں عدل و انصاف قائم کریگا اسکے لئے اگر کتاب عہد عتیق اور عہد جدید کا مطالعہ کیا جائے تو حقیقت واضح ہوجائے گی[1] اس سلسلہ میں پیغمبر خداؐ کی حدیث بھی موجود ہے کہ جسے مسلمان محدثین نے نقل کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ''؛ لولم یبق من الدھر الا یوم لبعث اللہ رجلاًمن أھل بیتی یملأ ھا عدلا کما ملئت جوراً [2] ''اگر زمانے کا صرف ایک ہی دن باقی بچے گا تب بھی خداوند عالم میرے خاندان میں سے ایک فرد کو مبعوث کرے گا جوکہ اس جہان کو اسی طرح سے عدالت سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و ستم سے بھرا ہوا ہوگا جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ دنیا میں ایک مصلح کے آنے کا عقیدہ تمام آسمانی شریعتوں میں موجود ہے اسی طرح اہل سنت کی صحیح اور مسند کتابوں میں بھی امام مھدی عج کے بارے میں بہت سی روایتیں نقل ہوئی ہیں اور ان دونوں (شیعہ اور سنی) اسلامی فرقوں کے محدثین اور محققین نے امام زمانہ عج کے بارے میں بہت سی کتابیں تحریر کی ہیں[3]. روایات کے اس مجموعے میں انکی وہ خصوصیات اور نشانیاں بیان ہوئی ہیں جو صرف شیعوں کے گیارہویں امام حسن عسکری ـ کے بلافصل فرزند ہی میں پائی جاتی ہیں[4] ان روایات کے مطابق امام مہدی ـ پیغمبر اکرمؐ کے ہم نام ہیں[5] ـیہاں اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ اس قسم کی طولانی عمر نہ تو علم اور دانش کے خلاف ہے اور نہ ہی منطق وحی سے تضاد رکھتی ہے آج کی علمی دنیا انسانوں کی طبیعی عمر کو بڑھانا چاہ رہی ہے صاحبان علم اور

---

[1] عہد عتیق : مز امیر داؤد ، مز مور ۹۷ ـ ۹۶ اور کتاب دانیال نبی باب ۱۲ عہد جدید : انجیل متی باب ۲۴ انجیل مرقوس باب ۱۳ انجیل لوقا باب ۲۱ (جہاں اس موعود کے بارے میں بیان ہوا ہے جس کے انتظار میں دنیا ہے۔)

[2] صحیح ابی داؤد جلد ۲ ص ۲۰۷ طبع مصر مطبعہ تازیہ ، ینابیع المودۃ ص ۴۳۲اور کتاب نور الابصار باب ۲ ص ۱۵۴.

[3] جیسے کتاب البیان فی اخبار صاحب الزمان تالیف محمد بن یوسف بن الکنجی الشافعی ہے اور اسی طرح کتاب البرھان فی علامات مھدی آخر الزمان تالیف علی بن حسام الدین جو کہ متقی ھندی کے نام سے مشہور ہیں اور اسی طرح کتاب المہدی والمہدویت تالیف احمد امین مصری ہے البتہ شیعہ علماء نے اس بارے میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جنہیں شمار کرنا آسان کام نہیں ہے جیسے کتاب الملاحم والفتن وغیرہ.

[4] ینابیع المودۃ باب ۷۶، مناقب میں جابر بن عبداللہ انصاری کی روایت ہے.

[5] صحیح ترمذی ،مطبوعہ دہلی ۱۳۴۲ ھ ،جلد ۲ ص ۴۶ اور مسند احمدمطبوعہ مصر ۱۳۱۳ ھ

سائنسدانوں کا یہ یقین ہے کہ ہر انسان کے اندر لمبی عمر گذارنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور اگر اسے بعض آفتوں اور بیماریوں سے بچالیا جائے تو قوی امکان ہے کہ اس کی عمر بڑھ جائیگی.تاریخ نے بھی اپنے دامن میں ایسے افراد کے نام محفوظ کئے ہیں جنھوں نے اس دنیا میں طولانی عمر پائی ہے. قرآن مجید حضرت نوح ـ کے بارے میں فرماتا ہے:(فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا[1]) اور (نوح)اپنی قوم کے درمیان نوسوپچاس سال رہے. اور اسی طرح قرآن مجید حضرت یونس ـ کے بارے میں فرماتا ہے: (فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ لَلَبِثَ فِي بَطْنِهِ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ[2]) پھر اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو روز قیامت تک اسی (مچھلی) کے شکم میں رہتے.اسی طرح قرآن مجیداور تمام مسلمانوں کے نظریہ کے مطابق حضرت خضر ـ اور حضرت عیسیٰ ـ ابھی تک باحیات ہیں اور زندگی گذار رہے ہیں ـ

[1] سوره عنکبوت آیت ۱۴
[2] سوره صافات آیت ۱۴۴

نواں سوال

اگر شیعہ حق پر ہیں تو وہ اقلیت میں کیوں ہیں؟اور دنیا کے اکثر مسلمانوں نے ان کو کیوں نہیں مانا ہے؟

جواب: کبھی بھی حق اور باطل کی شناخت ماننے والوں کی تعداد میں کمی یا زیادتی کے ذریعہ نہیں ہوتی,آج اس دنیا میں مسلمانوں کی تعداد اسلام قبول نہ کرنے والوں کی بہ نسبت ایک پنجم یا ایک ششم ہے جبکہ مشرق بعید میں رہنے والوں کی اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو بت اور گائے کی پوجا کرتے ہیں یا ماورائے طبیعت کا انکار کرتے ہیں,چین جس کی آبادی ایک ارب سے بھی زیادہ ہے کیمونیزم کا مرکز ہے اور ہندوستان جس کی آبادی تقریباً ایک ارب ہے اسکی اکثریت ایسے افراد کی ہے جو گائے اور بتوں کی پوجا کرتی ہے اسی طرح یہ ضروری نہیں ہے کہ اکثریت میں ہونا حقانیت کی علامت ہو قرآن مجید نے اکثر و بیشتر اکثریت کی مذمت کی ہے اور بعض اوقات اقلیت کی تعریف کی ہے اس سلسلے میں ہم چند آیات کو بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:۱۔ (وَلا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ[1]) اور تم اکثریت کو شکر گزار نہ پاؤگے.

۲۔ (إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلاَّ الْمُتَّقُونَ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لاَيَعْلَمُونَ[2]) اس کے ولی صرف متقی اور پرہیزگار افراد ہیں لیکن ان کی اکثریت اس سے بھی بے خبر ہے.

۳۔ (وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ[3]) اور ہمارے بندوں میں شکر گزار بندے بہت کم ہیں,لہذا کبھی بھی حقیقت کے متلاشی انسان کو اپنے آئین کی پیروی کرنے والوں کو اقلیت میں دیکھ کر گھبرانا نہیں چاہیئے اور اسی طرح اگر وہ اکثریت میں ہوجائیں تو فخر ومباہات نہیں کرنا چاہیئے بلکہ بہتر یہ ہے کہ ہر انسان اپنا چراغ عقل روشن کرے اور اس کی روشنی سے بہرہ مند ہو,ایک شخص نے حضرت امیر المومنین علی ـ کی خدمت میں عرض کیا یہ کیسے ممکن ہے کہ جنگ جمل میں آپ کے مخالفین اکثریت پر ہونے کے باوجود باطل

---

[1] سورہ اعراف آیت ۱۷
[2] سورہ انفال آیت ۳۴
[3] سورہ سبا آیت ۱۳

پر ہوں؟ امام ـ نے فرمایا ''؛ اِن الحق والباطل لایعرفان بأقدارالرجال. اعرف الحق تعرف أھلہ. اعرف الباطل تعرف أھلہ۔ ''حق اور باطل کی پہچان افراد کی تعداد سے نہیں کی جاتی بلکہ تم حق کو پہچان لو خود بخود اہل حق کو بھی پہچان لوگے اور باطل کو پہچان لوتو خود بخود اہل باطل کو بھی پہچان لوگے.ایک مسلمان شخص کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس مسئلے کو علمی اور منطقی طریقے سے حل کرے اور اس آیۂ شریفہ (وَلاتَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہِ عِلْمٌ[1]) کو چراغ کی مانند اپنے لئے مشعل راہ قرار دے اس سے ہٹ کر اگر دیکھا جائے تو اگرچہ اہل تشیع تعداد میں اہل سنت سے کم ہیں. لیکن اگر صحیح طور پر مردم شماری کی جائے تو یہ معلوم ہوجائے گا کہ دنیا بھر کے مسلمانوں میں ایک چوتھائی افراد شیعہ ہیں جوکہ دنیا کے مختلف مسلمان نشین علاقوں میں زندگی بسر کررہے ہیں[2].

واضح رہے کہ ہر دور میں شیعوں کے بڑے بڑے علماء اور مشہور مولفین اور مصنفین رہے ہیں اور یہاں پر یہ بھی واضح کردینا ضروری ہے کہ اکثر اسلامی علوم کے موجد اور بانی شیعہ ہی تھے جن میں سے چند یہ ہیں : علم نحو کے موجد ابوالاسود دئلی علم عروض کے بانی خلیل بن احمد علم صرف کے موجد معاذ بن مسلم بن ابی سارہ کوفی علم بلاغت کو فروغ دینے والوں میں سے ایک ابوعبداللہ بن عمران کاتب خراسانی (مرزبانی[3]) شیعہ علماء اور دانشوروں کی کثیر تالیفات (جن کو شمار کرنا بہت دشوار کام ہے) کی شناخت کے لئے کتاب (الذریعہ الی تصانیف الشیعہ) کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا.

---

[1] سورہ اسراء آیت ۳۶

[2] زیادہ وضاحت کیلئے ''اعیان الشیعہ''جلد ۱بحث۱۲اور صفحہ ۱۹۴کی طرف مراجعہ کیا جائے.

[3] اس بارے میں سید حسن صدر کی کتاب ''تاسیس الشیعہ '' کا مطالعہ کریں.

دسواں سوال

رجعت کیا ہےاور آپ اس پر کیوں عقیدہ رکھتے ہیں؟

جواب: عربی لغت میں رجعت کے معنی ہیں ''لوٹنا'' اسی طرح اصطلاح میں ''موت کے بعد اور قیامت سے پہلے کچھ انسانوں کے اس دنیا میں لوٹنے ''کو رجعت کہا جاتا ہے یہ رجعت حضرت مہدی ـ کے ظہور کے دور میں واقع ہوگی یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو نہ تو عقل کے مخالف ہے اور نہ ہی منطق وحی کے برخلاف ہے.اسلام اور دوسرے ادیان الٰہی کی نظر میں انسان کے وجود میں جو چیز اصل ہے وہ اس کی روح ہے جسے ''نفس'' کے نام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے یہی وہ چیز ہے جو بدن کے فنا ہوجانے کے بعد بھی باقی رہتی ہے اور اپنی جاودانہ زندگی بسر کرتی رہتی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن مجید کی نگاہ میں پروردگار عالم کی ذات قادر مطلق ہےاور کوئی بھی چیز اس کی لامحدود قدرت کو محدود نہیں کرسکتی۔

ان دو مختصر مقدموں کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ رجعت کا مسئلہ عقل کی نگاہ سے ایک ممکن امر ہے کیونکہ تھوڑی سی فکر سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ انسانوں کے ایک گروہ کو اس دنیا میں دوبارہ واپس بھیجنا ان کی پہلی خلقت کی بہ نسبت کئی گنا زیادہ آسان ہے.لہٰذا وہ پروردگار جس نے انہیں پہلے مرحلے میں خلق فرمایا ہے یقیناًان کو دوبارہ اس دنیا میں لوٹانے پر قادر ہے اگر وحی الٰہی کی بنیاد پر رجعت کو گزشتہ امتوں میں تلاش کیا جائے تواس کے مختلف نمونے مل سکتے ہیں.قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے:(وَإِذْ قُلْتُمْ یَامُوسَی لَنْ نُؤْمِنَ لَکَ حَتَّی نَرَی اﷲَ جَہْرَۃً فَأَخَذَتْکُمْ الصَّاعِقَۃُ وَأَنْتُمْ تَنظُرُونَ ثُمَّ بَعَثْنَاکُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُونَ[1]) اور وہ وقت بھی یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے کہا کہ ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو آشکارا طور پر نہ دیکھ لیں جس کے بعد بجلی نے تم کو لے ڈالا اور تم دیکھتے ہی رہ گئے. پھر ہم نے تمہیں موت کے بعد زندہ کردیا کہ شاید شکر گزار بن جاؤ.اسی طرح قرآن مجید

---

[1] سورہ بقرہ آیت :۵۵.۵۶

ایک اور مقام پر حضرت عیسی ـ کی زبان سے نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے:(وَأُحْيِي الْمَوْتَى بِإِذْنِ اللَّهِ[1]) اور میں خدا کی اجازت سے مردوں کو زندہ کروں گا.قرآن مجید نے نہ صرف یہ کہ رجعت کو ایک ممکن امر قرار دیا ہے بلکہ انسانوں کے ایک ایسے گروہ کی تائید بھی کی جو اس دنیا سے جاچکا تھا اور پھر اس دنیا میں دوبارہ واپس آگیا قرآن مجید نے مندرجہ ذیل دو آیتوں میں ان دو گروہوں کا تذکرہ کیا ہے جو مرنے کے بعد قیامت سے قبل دنیا میں واپس آئے ہیں.(وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِمَّنْ يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ[2]) اور جب ان پر وعدہ پورا ہوگا تو ہم زمین سے ایک چلنے والی مخلوق کو نکال کر کھڑا کردیں گے جو ان سے یہ بات کرے کہ کون لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں رکھتے تھے.اور اس دن ہم ہر امت میں سے ان لوگوں کی ایک فوج اکھٹا کریں گے جو ہماری آیتوں کی تکذیب کیا کرتے تھے اور پھر ان کو روک لیا جائے گا.

ان دو آیتوں کے ذریعہ قیامت سے پہلے واقع ہونے والی رجعت کے سلسلے میں استدلال کرنے کے لئے مندرجہ ذیل نکات کی طرف توجہ ضروری ہے:۱ـتمام مسلمان مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ یہ دو آیتیں قیامت سے متعلق ہیں اور پہلی آیت قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی کو بیان کررہی ہے، اس سلسلے میں جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر ''الدرالمنثور'' میں ابن ابی شیبہ اورانہوں نے حذیفہ سے نقل کیا ہے کہ ''خروج دابۃ'' (چلنے والی مخلوق کا نکلنا) قیامت سے پہلے رونماہونےوالے واقعات میں سے ایک ہے[3].

۲ـاس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ قیامت کے دن تمام انسانوں کو محشور کیا جائے گا ،اور ایسا نہیں ہے کہ اس دن ہر امت میں سے ایک خاص گروہ کو محشور کیا جائے گا. قرآن مجید نے قیامت میں تمام انسانوں کے محشور ہونے کے بارے میں یوں فرمایا ہے:(ذَلِكَ يَوْمٌ مَجْمُوعٌ لَهُ النَّاسُ[4]) وہ ایک دن ہے جس میں تمام لوگ جمع کئے جائیں گے[5].اور ایک جگہ فرماتا ہے:(وَيَوْمَ

---

[1] سورہ آل عمران آیت: ۴۹

[2] سورہ نمل آیت ۸۲اور ۸۳.

[3] تفسیر درمنثور جلد ۵ ص ۱۷۷۔ سورہ نمل کی آیت نمبر ۸۲کی تفسیر کے ذیل میں.

[4] سورہ ہود آیت : ۱۰۳

[5] تفسیر درمنثور جلد ۳ ص ۳۴۹ ۔اس دن کی تفسیر قیامت سے کی گئی ہے۔

نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً وَ حَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا [1])اور جس دن ہم پہاڑوں کو حرکت میں لائیں گے اور تم زمین کو بالکل کھلا ہوا دیکھو گے اور ہم سب کو اس طرح جمع کریں گے کہ کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے. اس اعتبار سے قیامت کے دن تمام انسان محشور ہوں گے اور یہ بات انسانوں کے کسی خاص گروہ سے مخصوص نہیں ہے.

۳۔ان دو گذشتہ آیتوں میں دوسری آیت اس بات کا صریح اعلان کررہی ہے کہ امتوں میں سے کچھ خاص افراد کو محشور کیا جائے گا اور تمام انسانوں کو محشور نہیں کیا جائے گا کیونکہ آیہ کریمہ میں ہے: (ویوم نحشر من کل أمة فوجاً ممن یکذب بآیاتنا)اور اس دن ہم ہر امت میں سے ان لوگوں کی ایک فوج اکھٹا کریں گے جو ہماری آیتوں کی تکذیب کیا کرتے تھے.آیت کا یہ حصہ واضح طور پر اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ تمام انسانوں کو محشور نہیں کیا جائے گا.

نتیجہ:ان تین مختصر مقدموں کی روشنی میں یہ مطلب اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ آیات الہی کی تکذیب کرنے والے انسانوں میں سے ایک خاص گروہ کا محشور ہونا ایک ایسا واقعہ ہے جو قیامت سے پہلے واقع ہوگا اور یہی بات دوسری آیت سے بھی سمجھ میںآتی ہے. کیونکہ قیامت کے دن کوئی خاص گروہ محشور نہیں ہوگا بلکہ اس دن تمام انسان محشور کئے جائیں گے اس بیان کے ساتھ ہمارا یہ دعوی صحیح ثابت ہوجاتا ہے کہ انسانوں کے ایک خاص گروہ کو ان کی موت کے بعد قیامت سے پہلے اس دنیا میں لوٹایا جائے گااور اسی کا نام ''رجعت'' ہے.اسی طرح اہل بیت پیغمبر ؑنے بھی جو ہمیشہ قرآن کے ہمراہ ہیں اور کلام الہی کے حقیقی مفسر ہیں اس سلسلے میں اپنی احادیث کے ذریعہ وضاحت فرمائی ہے یہاں پر ہم اختصار کی وجہ سے ان کے صرف دو ارشادات کی طرف اشارہ کرتے ہیں :امام صادق ۔ فرماتے ہیں '':أیام اللّٰہ ثلاثة یوم القائم ۔ ویوم الکرّة، و یوم القیامة'' خدا کے تین دن ہیں حضرت امام مہدی ۔ کا دن ،رجعت کا دن ،اور قیامت کا دن. اور ایک مقام پر فرماتے ہیں '': لیس منا مَن لم یؤمن بکرّتنا ۔ ''جو شخص ہماری رجعت کو قبول نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے.آخر میں مناسب ہے کہ دو اہم نکتوں کو واضح کردیا جائے:۱۔رجعت کا فلسفہ

---

[1] سورہ کہف آیت: ۴۷

رجعت کے اسباب و علل کے بارے میں غور کرنے سے دو اہم مقاصد سمجھ میں آتے ہیں.پہلا مقصد یہ ہے کہ رجعت کے ذریعہ اسلام کی حقیقی عزت و عظمت اور کفر کی ذلت کو آشکار کیا جائے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ باایمان اور نیک انسانوں کو ان کے اعمال کی جزا مل سکے اور کافروں اور ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جا سکے.

۲۔ رجعت اور تناسخ[1] کے درمیان واضح فرق:یہاں پر اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ شیعہ جس رجعت پر عقیدہ رکھتے ہیں :اس کا لازمہ تناسخ کا معتقد ہونا نہیں ہے کیونکہ نظریہ تناسخ کی بنیاد قیامت کے انکار پر ہے اور تناسخ والے اپنے اس نظرئیے کے مطابق دنیا کو دائمی طور پر گردش میں جانتے ہیں اوراس کا ہر دور اپنے پہلے والے دور کی تکرار ہے.اس نظرئیے کے مطابق انسان کے مرنے کے بعد اس کی روح دوبارہ اس دنیا میں پلٹتی ہے اور کسی دوسرے بدن میں منتقل ہوجاتی ہے اور اگر وہ روح گزشتہ زمانے میں کسی نیک آدمی کے جسم میں رہی ہو تو اب اس زمانے میں کسی ایسے آدمی کے بدن میں منتقل ہو جائے گی جس کی زندگی خوشی و مسرت کے ساتھ بسر ہونے والی ہو لیکن اگر یہ روح گزشتہ زمانے میں کسی بدکار آدمی کے جسم میں رہی ہو تو اس زمانے میں ایسے آدمی کے بدن میں منتقل ہو جائے گی جس کی زندگی سختیوں میں گزرنے والی ہو اس نظرئیے کے اعتبار سے روح کا اس طرح سے واپس لوٹنا ہی اسکی قیامت ہے.جبکہ رجعت کا عقیدہ رکھنے والے اسلامی شریعت کی پیروی کرتے ہوئے قیامت اور معاد پر مکمل ایمان رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ کسی روح کا ایک بدن سے کسی دوسرے بدن میں منتقل ہونا محال ہے[2] اہل تشیع رف یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انسانوں میں سے ایک گروہ قیامت سے پہلے اس دنیا میں واپس آئے گا اور چند حکمتوں اور مصلحتوں کے پورا ہوجانے کے بعد پھر اس دنیا سے چلا جائے گا.یہاں تک کہ یہ گروہ بھی باقی انسانوں کے ساتھ قیامت کے دن اٹھایا جائے گا.اس اعتبار سے روح ایک بدن سے جدا ہونے کے بعد ہرگز دوسرے بدن میں منتقل نہیں ہوگی۔

---

[1] تناسخ : یعنی روح کا ایک بدن سے نکل کر دوسرے میں داخل ہوجاناجسے آواگون کہتے ہیں.(مترجم)

[2] صدرالمتألہین نے اپنی کتاب اسفار (جلد ۹ باب ۸ فصل اول ص۳) میں نظریہ تناسخ کو باطل کرتے ہوئے یوں تحریر فرمایا ہے: اگر ایک بدن سے نکلی ہوئی روح کسی دوسرے بدن میں اس حالت میں داخل ہوجائے جبکہ وہ بدن ابھی جنین کی شکل میں رحم مادر میں ہے یا اس کے علاوہ کسی دوسرے مرحلہ میں ہو تو اس صورت مینیہ لازم آئے گا کہ ایک ہی چیز بالقوہ بھی ہو اوربالفعل بھی،اور جو چیز بالفعل ہے اس کا بالقوۃ ہونا محال ہے اس لئے کہ ان دونوں میں مادی و اتحادی ترکیب ہے اور ایسی ترکیب طبیعی محال ہے جس میں دو ایسے امر جمع ہورہے ہوں جن میں سے ایک بالفعل ہے اور دوسرا بالقوہ.

گیارہواں سوال

جس شفاعت کا آپ عقیدہ رکھتے ہیں وہ کیا ہے؟

جواب: شفاعت، اسلام کی ایک ایسی مسلم الثبوت اصل ہے جسے تمام اسلامی فرقوں نے قرآن کی آیات اور روایات کی پیروی کرتے ہوئے قبول کیا ہے بس صرف ان کے درمیان شفاعت کے نتیجے کے بارے میں اختلاف نظر ہے. شفاعت کی حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسا محترم انسان جو پروردگار کے نزدیک صاحب مقام و منزلت ہو وہ خداوند متعال سے کسی شخص کے گناہوں کی بخشش یا اس کے درجات کی بلندی کی دعا کرے.رسول گرامی [ص] فرماتے ہیں'' :أعطیت خمسا...و أعطیت الشفاعة فادخرتها لأمتي[1] ''پانچ چیزیں مجھے عطا کی گئی ہیں...اور شفاعت مجھے عطا ہوئی ہے جسے میں نے اپنی امت کے لئے ذخیرہ کردیا ہے .

شفاعت کا دائرہ

قرآن مجید کی نگاہ میں وہ شفاعت صحیح نہیں ہے جو کسی قید اور شرط کے بغیر ہو بلکہ شفاعت صرف مندرجہ ذیل صورتوں میں مؤثر ہوگی:۱۔شفاعت کرنے والا اس وقت شفاعت کرسکتا ہے جب کہ اسے شفاعت کرنے کے لئے خداوندعالم کی جانب سے اجازت حاصل ہو لہذا صرف وہ لوگ شفاعت کرسکتے ہیں جنہیں خدا سے معنوی قربت بھی حاصل ہو اوروہ اذن شفاعت بھی رکھتے ہوں قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے:(لایَمْلِکُونَ الشَّفَاعَۃَ إِلاَّ مَنْ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَانِ عَہْدًا[2]) اس وقت کوئی شفاعت کے سلسلے میں صاحب اختیار نہ ہوگا مگر وہ جس نے رحمان کی بارگاہ میں شفاعت کا عہد لے لیا ہے.اور ایک اور جگہ پر فرماتا ہے:(یَوْمَئِذٍ لاتَنْفَعُ الشَّفَاعَۃُ إِلاَّ مَنْ أَذِنَ لَہُ الرَّحْمَانُ وَرَضِیَ لَہُ قَوْلاً[3]) اس دن کسی کی سفارش کام نہ آئے گی سوائے ان کے جنہیں خدا نے اجازت دے دی ہو اور وہ ان کی بات سے راضی ہو.

---

[1] مسند احمدجلد ۱ ص ۳۰۱ ، صحیح بخاری جلد ۱ ص۹۱ ط مصر.
[2] سورہ مریم آیت: ۸۷
[3] سورہ طہ آیت: ۱۰۹

۲۔ضروری ہے کہ جو شخص شفاعت حاصل کرنا چاہتا ہے وہ شفاعت کرنے والے کے ذریعے فیض الہی کو لینے کی صلاحیت رکھتا ہو یعنی اس شخص کا خدا سے ایمانی رابطہ اور شفاعت کرنے والے سے روحانی رشتہ ٹوٹنے نہ پائے، لہذا کفار چونکہ خداوند کریم سے ایمانی رابطہ نہیں رکھتے اور اسی طرح بعض گنہگار مسلمان جیسے بے نمازی اور قاتل افراد چونکہ شفاعت کرنے والے سے روحانی رشتہ توڑ بیٹھے ہیں لہذا یہ سب شفاعت کے مستحق قرار نہیں پائیں گے.قرآن مجید بے نمازی اور منکر قیامت کے بارے میں فرماتا ہے: (فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِين[1]) تو انہیں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت بھی کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی.

اور قرآن مجید ظالم افراد کے بارے میں فرماتا ہے: (مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلاَشَفِيعٍ يُطَاعُ[2]) اور ظالموں کیلئے نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ ہی سفارش کرنے والا جس کی بات سن لی جائے.

شفاعت کا فلسفہ

شفاعت، توبہ کی طرح امید کا ایک دروازہ ہے جسے ایسے لوگوں کیلئے قرار دیا گیا ہے جو گناہ اور ضلالت کے راستے کو چھوڑ کر اپنی باقی ماندہ عمر کو خدا کی اطاعت میں گزارنا چاہتے ہیں کیونکہ جب بھی گنہگار انسان یہ احساس کرلے کہ صرف چند محدود شرطوں کیساتھ (نہ یہ کہ ہر حالت میں) شفاعت کرنیوالے کی شفاعت کا مستحق ہوسکتا ہے تو پھر وہ کوشش کریگا کہ ان شرطوں کا خیال رکھے اور سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے.

شفاعت کا نتیجہ

مفسرین کے درمیان اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ شفاعت کا نتیجہ گناہوں کی بخشش ہے یا اس کا نتیجہ بلندی درجات ہے لیکن اگر پیغمبر گرامیؐ کے اس ارشاد کو ملاحظہ کیا جائے جس میں آنحضرت [ص] فرماتے ہیں کہ '': اِن شفاعتي يوم القيامة لأهل الكبائر من

---

[1] سورہ مدثر آیت : ۴۸
[2] سورہ غافر آیت :۱۸

أمتي[١]'' ''میری شفاعت قیامت کے دن میری امت کے ان افراد کے لئے ہوگی جو گناہان کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہیں '' تو پہلا نظریہ زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

[١] سنن ابن ماجہ جلد ٢ ص ٥٨٣،مسند احمد جلد ٣ ص ٢١٣، سنن ابی داؤد جلد ٢ ص ٥٣٧، سنن ترمذی جلد ۴ ص ۴۵

بارہواں سوال

کیا حقیقی شفاعت کرنے والوں سے بھی شفاعت کی درخواست کرنا شرک ہے؟اس سوال کی وضاحت میں کہا جاتا ہے کہ شفاعت کرنا خدا کا مخصوص حق ہے جیسا کہ قرآن کریم اس بارے میں فرماتا ہے: (قُلْ لِلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیعًا[1]) کہہ دیجئے کہ شفاعت کا تمام تر اختیار اللہ کے ہاتھوں میں ہے. لہذا غیر خدا سے شفاعت کی درخواست کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے مطلق حق کو اس کے بندے سے مانگا جائے در حقیقت اس قسم کی درخواست غیر خدا کی عبادت کرنا ہے اوریہ ''توحید عبادی'' کے خلاف ہے.جواب:یہاں اس کی ذات یا اس کی خالقیت اور اسکے مدبر ہونے میں شرک نہیں ہے یہاں شرک سے مراد اسکی عبادت میں شرک کرنا ہے. واضح ہے کہ اس مسئلے کی وضاحت، عبادت کی صحیح تفسیر پر منحصر ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ عبادت کی تفسیر کرنے کا ہمیں اختیار نہیں دیا گیا تاکہ کہیں ہم مخلوق کے مقابلے میں ہر قسم کے خضوع اور کسی بندے سے کسی قسم کی درخواست کرنے کو عبادت قرار نہ دے بیٹھیں بلکہ قرآن مجید کی اس صراحت کے مطابق فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ کیا ہے: (فَإِذَا سَوَّیْتُہُ وَنَفَخْتُ فِیہِ مِن رُوحِي فَقَعُوا لَہُ سَاجِدِینَ فَسَجَدَ الْمَلاَئِکَۃُ کُلُّہُمْ أَجْمَعُونَ[2]) جب میں اسے درست کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب سجدے میں گرپڑنا .توتمام ملائکہ نے سجدہ کرلیا.

یہ سجدہ اگرچہ خداوندعالم کے فرمان سے انجام پایا تھاپھر بھی یہ حضرت آدمؑ کی عبادت کے لئے نہ تھا ورنہ خداوند اس کے بجالانے کا حکم نہ دیتا. اور اسی طرح ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں اور خود حضرت یعقوبؑ نے جناب یوسفؑ کو سجدہ کیا تھا: (وَرَفَعَ أَبَوَیْہِ عَلَی الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَہُ سُجَّدًا[3]) اور انہوں نے والدین کو تخت کے اوپر پر جگہ دی اور سب لوگ یوسف کے سامنے سجدے میں گرپڑے. اگر اس قسم کا خضوع حضرت یوسفؑ کی عبادت ہوتا تو اسے نہ تو حضرت یعقوبؑ جیسے معصوم نبی بجالاتے اور

[1] سورہ زمر آیت۴۴
[2] سورہ ص آیت: ۷۲اور ۷۳
[3] سورہ یوسف آیت:۱۰۰

نہ ہی اپنے بیٹوں کے اس کام سے راضی ہوتے جب کہ کوئی خضوع بھی سجدے سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا اسی بنیاد پر ضروری ہے کہ ہم خضوع اور کسی غیر سے درخواست کرنے کو عبادت سے جدا سمجھیں.عبادت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی موجود کو خدا تصور کرے اور پھر اس کی عبادت کرے یا کسی شے کو مخلوق خدا تو جانے لیکن یہ تصور کرے کہ خدائی امور جیسے کائنات کی تدبیر اور گناہوں کی بخشش اس شے کے سپرد کردئیے گئے ہیں۔

لیکن اگر کسی شخص کے لئے ہمارا خضوع ایسا ہو کہ نہ تو ہم اسے خدا سمجھیں اور نہ ہی یہ تصور کریں کہ خدائی امور اس کے سپرد کردئیے گئے ہیں تو ہمارا یہ خضوع اس کے احترام کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا بالکل ایسے ہی جیسے فرشتوں نے جناب آدم ۔اور جناب یعقوبؑ کے بیٹوں نے جناب یوسفؑ کا احترام کیا تھا یہی بات شفاعت کے سلسلے میں بھی کہی جائے گی کہ اگر یہ تصور کیا جائے کہ شفاعت کرنے کا حق پوری طرح سے ان شفاعت کرنے والوں کے سپرد کردیا گیا ہے اور وہ بغیر کسی قید وشرط کے شفاعت کر سکتے ہیں اور گناہوں کی مغفرت کا سبب بن سکتے ہیں تو اس طرح کا عقیدہ شرک کا سبب بنتا ہے کیونکہ ہم نے خدا کے کام کو غیر خدا سے طلب کیا ہے لیکن جب بھی ہم تصور کریں کہ خدا کے کچھ پاک بندے ایسے ہیں جو شفاعت کے مالک تو نہیں ہیں لیکن کچھ مخصوص شرائط کے ساتھ گناہ گار بندوں کی شفاعت کرنے کی اجازت رکھتے ہیں کیونکہ شفاعت کی اہم ترین شرط یہی اذن اور رضایت پروردگار ہے تو واضح ہے کہ ایک صالح بندے سے اس طرح کی شفاعت طلب کرنے کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ ہم اسے خدا مان بیٹھے ہیں اسی طرح اس کا لازمہ یہ بھی نہیں ہے کہ خدا کے امور اس کو سونپ دئیے گئے ہیں بلکہ ہم نے اس سے ایسے کام کی درخواست کی ہے جس کی وہ لیاقت رکھتا ہے ہم پیغمبر خداؐ کی حیات طیبہ میں اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ گناہ گار افراد آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر مغفرت کی درخواست کرتے تھے.لیکن آنحضرتؐ کبھی بھی ان کی طرف شرک کی نسبت نہیں دیتے تھے.جیسا کہ سنن ابن ماجہ میں پیغمبر خداؐ سے ایک روایت موجود ہے کہ جس میں آپؐ فرماتے ہیں'' :أتدرون ما خيّرني ربي الليلة؟ قلنا : اللہ و رسولہ أعلم .قال: فإنہ خيّرني بين أن يدخل نصف أمتي الجنۃ و بين الشفاعۃ فاخترت الشفاعۃ .قلنا يارسول اللہ: ادع اللہ أن يجعلنا من أہلھا قال ہي لکل

مسلم[1] "کیا تم جانتے ہو کہ آج کی رات میرے رب نے مجھے کن چیزوں کے درمیان اختیار دیا تھا؟ ہم نے کہا خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں. پیغمبرؐ نے فرمایا اس نے مجھے اختیار دیا ہے کہ یا تو میری آدھی امت جنت میں چلی جائے یا پھر میں شفاعت کا حق لے لوں میں نے حق شفاعت کو اختیار کرلیا. ہم نے کہا اے پیغمبر خداؐ اپنے پروردگار سے دعا کیجئے کہ ہمیں بھی شفاعت حاصل کرنے کے لائق بنا دے. پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا : شفاعت ہر مسلمان کے لئے ہوگی.

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اصحاب پیغمبرؐ آنحضرت سے شفاعت کی درخواست کیا کرتے تھے اسی لئے انہوں نے پیغمبرؐ سے کہا تھا "ادع اللہ." قرآن مجید بھی فرماتا ہے: (ولَوْ أنَّهُمْ إذْ ظَلَمُوا أنفُسَهُمْ جَاءوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللهَ تَوَّابًا رَحِيمًا[2]) اور اے کاش جب ان لوگوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تھا تو آپ کے پاس آتے اور خود بھی اپنے گناہوں کے لئے استغفار کرتے اور رسول بھی ان کے حق میں استغفار کرتے تو یہ خدا کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے. اسی طرح قرآن مجید ایک اور مقام پر جناب یعقوبؑ کے بیٹوں کی درخواست کو نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے: (قَالُوا يَاأَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ[3])ان لوگوں نے کہا باباجان اب آپ ہمارے گناہوں کے لئے استغفار کریں ہم یقیناً خطاکار تھے.اور حضرت یعقوبؑ نے بھی ان کے لئے استغفار کرنے کا وعدہ کیا اور ہرگز اپنے بیٹوں پر شرک کا الزام نہیں لگایا.(قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي إنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ[4]) انہوں نے کہا کہ میں عنقریب تمہارے حق میں استغفار کروں گا کہ میرا پروردگار بہت بخشنے والا اور مہربان ہے.

[1] سنن ابن ماجہ جلد ۲ ، باب ذکر الشفاعۃ ص ۵۸۶
[2] سورہ نساء آیت:۶۴
[3] سورہ یوسف آیت: ۹۷
[4] سورہ یوسف آیت: ۹۸

تیرہواں سوال

کیا غیر خدا سے مدد مانگنا شرک ہے؟

جواب: عقل اور منطق وحی کے اعتبار سے تمام انسان بلکہ کائنات کے تمام موجودات جس طرح وجود میں آنے کے لئے خدا کے محتاج ہیں اسی طرح دوسروں پر اثر انداز ہونے کے لئے بھی اس کے محتاج ہیں.قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے: (یاأیُّها النَّاسُ أنتُم الفُقَرَاءِ إلَی اللّہِ وَاللّہ ہُوَ الغَنِيُّ الحَمِیدُ[1]) اے لوگو تم سب اللہ کی بارگاہ کے فقیر ہو اور اللہ صاحب دولت اور قابل حمد وثنا ہے.

اسی طرح دوسری جگہ فرماتا ہے کہ ہر قسم کی فتح اور نصرت پروردگار جہان کے قبضۂ قدرت میں ہے.(وَمَا النَّصرُ إلاَّ مِن عِندِ اللّہِ العَزِیزِ الحَکِیمِ[2]) مدد تو ہمیشہ صرف خدائے عزیز و حکیم ہی کی طرف سے ہوتی ہے.

اسلام کی اس مسلم الثبوت اصل کی بنیاد پر ہم سب مسلمان اپنی ہر نماز میں اس آیہ شریفہ کی تلاوت کرتے ہیں: (إیّاکَ نَعبُدُ وَإیّاکَ نَستَعِین)ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں,اس مقدمہ کی روشنی میں اب ہم مذکورہ سوال کے جواب میں یہ کہنا چاہیں گے کہ: غیر خدا سے مدد مانگنا دو صورتوں میں قابل تصور ہے: ا۔ پہلی صورت یہ ہے کہ ہم کسی انسان یا موجودات میں سے کسی سے اس طرح مدد مانگیں کہ اسے اس کے وجود یا اس کے اپنے کاموں میں مستقل سمجھیں اور اسے مدد پہنچانے میں خدا سے بے نیاز تصور کریں. ایسی صورت میں شک نہیں ہے کہ غیر خدا سے مدد مانگنا شرک ہوگا جیسے قرآن مجید درج ذیل آیت میں اس کو باطل قرار دیتا ہے.(قُلْ مَن ذَا الَّذِي یَعصِمُکُمْ مِنَ اللّہِ إن أرَادَ بِکُمْ سُوءًا أوْ أرَادَ بِکُمْ رَحمَۃً وَلایَجِدُونَ لَہُمْ مِن دُونِ اللّہِ وَلِیًّا وَلاَنَصِیرًا[3]) کہہ دیجئے کہ اگر خدا برائی کا ارادہ کرلے یا بھلائی ہی کرنا چاہے تو تمہیں اس سے کون بچا سکتا ہے اور یہ لوگ اس کے علاوہ نہ کوئی سرپرست پاسکتے ہیں اور نہ مددگار .

---

[1] سورہ فاطر آیت ١٥
[2] سورہ آل عمران آیت ١٢٦
[3]

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی انسان سے مدد مانگتے وقت اسے خدا کی مخلوق اوراس کا ضرورتمندبندہ سمجھا جائے اوریہ عقیدہ ہو کہ وہ اپنی طرف سے کسی قسم کا استقلال نہیں رکھتا اور اسے بندوں کی مشکلات کو حل کرنے کی صلاحیت خدا ہی نے عطا فرمائی ہے.اس فکر کی رو سے اگر کسی چیز میں ہم اس انسان سے مدد مانگ رہے ہیں تو وہ اس سلسلے میں واسطے کا کام کرتا ہے کیونکہ پروردگار نے اسے بندوں کی حاجات کو پورا کرنے کے لئے ''وسیلہ'' قرار دیا ہے اس قسم کی مدد مانگنا حقیقت میں خداوندکریم سے مدد مانگنا ہے کیونکہ اسی نے ان وسائل اور اسباب کو وجود بخشا ہے اور اسی نے اس شخص کو انسانوں کی حاجات کو پورا کرنے کی صلاحیت اور قدرت عطا کی ہے اصولی طور پر بشر کی زندگی کی اساس ان اسباب اور مسببات سے مدد مانگنے پر استوار ہے اس طرح کہ ان سے مدد نہ لینے کی صورت میں انسان کی زندگی اضطراب کا شکار ہوجائیگی یہاں پر ہم اگر انہیں اس نگاہ سے دیکھیں کہ وہ خدا کی مدد پہنچانے کا وسیلہ ہیں اور ان کا وجوداور ان کی تاثیر خدا کی طرف سے ہے تو ان سے مدد مانگنا کسی بھی اعتبار سے توحید اور یکتا پرستی کے خلاف نہیں ہے.ایک موحد اور خدا شناس کسان جو کہ زمین پانی ہوا اور سورج سے مدد لے کر ایک بیج کو ایک پھل دار درخت میں تبدیل کردیتا ہے تو حقیقت میں وہ کسان خدا سے مدد مانگتا ہے کیونکہ وہی ہے کہ جس نے ان اسباب کو قدرت اور استعداد بخشی ہے. واضح ہے کہ یہ مدد مانگنا توحید اور یکتا پرستی سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے.بلکہ قرآن مجید تو ہمیں بعض چیزوں (جیسے صبر اور نماز) سے مدد لینے کا حکم دیتا ہے اور فرماتا ہے: (وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ[1]) صبر اور نماز کے ذریعہ مدد مانگو.واضح ہے کہ صبر اور پائیداری انسان کا کام ہے اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ان سے مدد حاصل کریں جب کہ اس قسم کی استعانت خدا سے مانگی جانے والی اس مدد کی مخالف نہیں ہے جسے اِیّاکَ نَستعین کے ذریعہ طلب کیا جاتا ہے۔

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۴۵

چودہواں سوال

کیا دوسروں کو پکارنا ان کی عبادت اور شرک ہے؟

جواب:اس قسم کے سوال کا سبب قرآن مجید کی وہ آیتیں ہیں جو اپنے ظاہری معنی کے اعتبار سے غیر خدا کو پکارنے سے روکتی ہیں:(وَأنَ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ فَلا تَدْعُوا مَعَ اللّٰہِ أَحَدًا[1]) اور مساجد سب اللہ کے لئے ہیں لہذا اس کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو. (وَلاتَدْعُ مِن دُونِ اللّٰہِ ما لایَنْفَعُکَ وَلایَضُرُّکَ[2]) اور خدا کے علاوہ کسی ایسے کو آواز نہ دو جو نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان. بعض لوگ اس قسم کی آیتوں کو سند بنا کر یہ کہتے ہیں کہ اولیائے خدا اور صالحین کو ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد پکارنا شرک اور ان کی عبادت ہے.

واب: اس سوال کے جواب میں مناسب یہ ہے کہ سب سے پہلے ان دو کلمات ''دعا'' اور ''عبادت'' کے معنی واضح کردئے جائیں اس میں شک نہیں کہ عربی زبان میں لفظ دعا کے معنی ندا اور پکارنے کے ہیں اور لفظ عبادت کے معنی پرستش کے ہیں اس اعتبار سے یہ دونوں الفاظ ہرگز ہم معنی نہیں ہیں یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہر ندا اور طلب عبادت اور پرستش ہے اس کی مندرجہ ذیل دلیلیں ہیں: ۱۔قرآن مجید میں لفظ دعوت بعض ایسی جگہوں پر استعمال ہوا ہے جہاں ہرگز یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے مراد عبادت ہے جیسے:(قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلاً وَنہارًا[3]) انہوں نے کہا پروردگار میں نے اپنی قوم کو دن میں بھی بلایا اور رات میں بھی. کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت نوحـ کی مراد یہ تھی کہ میں نے دن رات ان کی عبادت کی ہے.لہذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دعوت (پکارنا

---

[1] سورہ جن آیت :۱۸
[2] سورہ یونس آیت : ۱۰۶
[3] سورہ نوح آیت: ۵

) اور عبادت ہم معنی کلمات ہیں لہذا اگر کوئی شخص پیغمبر اکرمؐ یا کسی اور صالح بندے سے مدد طلب کرے اور انہیں پکارے تو اس کا یہ عمل ان کی عبادت شمار نہیں کیا جائے گا کیونکہ دعوت کے معنی میں پرستش کی بہ نسبت زیادہ عمومیت ہے.

۲۔آیات کے اس مجموعے میں دعا سے مراد ہر قسم کا پکارنا نہیں ہے بلکہ ایک خاص قسم کا پکارنا مقصود ہے جو کہ لفظ پرستش کا لازمہ ہوسکتا ہے کیونکہ یہ آیات ان بت پرستوں کے بارے میں آئی ہیں جو اپنے بتوں کو چھوٹے خدا تصور کرتے تھے. اس میں شک نہیں ہے کہ بت پرستوں کا خضوع ان کی دعا اور ان کی فریاد یہ سب ایسے بتوں کے مقابلے میں تھا جنہیں وہ حق شفاعت اور مغفرت کا مالک سمجھتے تھے ان کی نگاہ میں یہ بت دنیا اور آخرت کے امور میں مستقل طور پر حق تصرف رکھتے تھے اب یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان شرائط کے ساتھ ان موجودات کو پکارنا اور ان سے کسی قسم کی التجا کرنا ان کی عبادت شمار ہوگا کیونکہ وہ ان کو خدا کی حیثیت سے پکارتے تھے اور اس کا بہترین گواہ درج ذیل آیت ہے:(فَمَا أَغْنَتْ عَنْهُمْ آلِهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُونَ مِن دُونِ اللهِ مِن شَيْءٍ [۱]) عذاب کے آجانے کے بعد انکے وہ خدا بھی کام نہ آئے جنہیں وہ خدا کو چھوڑ کر پکار رہے تھے.

لہذا یہ آیتیں ہماری بحث سے کوئی ربط نہیں رکھتیں کیونکہ ہماری بحث کا موضوع ایک بندے کا دوسرے بندے سے کوئی التجا کرنا ہے جبکہ یہ بندہ اسے نہ تو اپنا خدا سمجھتا ہے اور نہ ہی اسے دنیا و آخرت کے امور میں اپنا مالک ،تام الاختیار یا تصرف کرنے والا مانتا ہے بلکہ اسے خدا کا ایسا معزز اور محترم بندہ سمجھتا ہے جسے پروردگار عالم نے منصب رسالت یا امامت سے نوازا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ اس کی دعا کو اپنے بندوں کے حق میں قبول کرے گا اس سلسلے میں خدا فرماتا ہے: (وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللهَ تَوَّابًا رَحِيمًا [۲]) اور کاش جب ان لوگوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تھا تو آپ کے پاس آتے اور خود بھی استغفار کرتے اور رسول بھی ان کے حق میں استغفار کرتے تو یہ خدا کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے.

---

[۱] سورہ ہود آیت :۱۰۱.
[۲] سورہ نساء آیت:۶۴.

۳۔مذکورہ آیات اس بات پر شاہد ہیں کہ دعوت سے مراد ہر قسم کی درخواست اور حاجت نہیں ہے،بلکہ اس دعوت سے مراد پرستش ہے اسی لئے ایک آیت میں لفظ دعوت کے بعد بلا فاصلہ اسی معنی کیلئے لفظ ''عبادت'' استعمال کیا گیا ہے(وَقالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ داخِرِينَ[1]) اور تمہارے پروردگار کا ارشاد ہے کہ مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا اور یقیناً جو لوگ میری عبادت سے اکڑتے ہیں وہ عنقریب ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے،جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا اس آیت کے آغاز میں لفظ ''ادعونی'' ہے اور اس کے ذیل میں لفظ ''عبادتی'' آیا ہے یہ اس بات پر شاہد ہے کہ ان آیتوں میں لفظ دعوت سے مراد وہ التجا و استغاثہ ہے جو ایسے موجودات سے کیا جاتا ہے جنہیں وہ خدا کی صفات سے متصف سمجھتے تھے۔

نتیجہ:ان گزشتہ تین مقدموں کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان آیات میں قرآن مجید کا بنیادی مقصد بت پرستوں کو،بتوں کو پکارنے سے روکنا ہے وہ بت کہ جنہیں وہ خدا کا شریک یا مدبر یا صاحب شفاعت جانتے تھے،کفار کا ان بتوں کے سامنے ہر قسم کا خضوع اور احترام یا گریہ اور استغاثہ کرنا اور ان سے شفاعت کا طلب کرنا یا پھر ان سے اپنی حاجت طلب کرنا یہ سب اس وجہ سے تھا کہ وہ ان بتوں کو چھوٹے خدا سمجھتے تھے اور انہیں خدا کے کاموں کو انجام دینے والا تصور کرتے تھے،بت پرستوں کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا نے دنیا اور آخرت کے متعلق بعض کام ان بتوں کو سونپ دئے ہیں اس اعتبار سے ان آیتوں کا ایک ایسے روح رکھنے والے انسان سے استغاثہ کرنے سے کیا تعلق ہے جو پکارنے والے کی نظر میں ذرہ برابر بھی بندگی کی حد سے باہر قدم نہیں رکھتا بلکہ اس کی نگاہ میں خداوندعالم کا محبوب و محترم بندہ ہے۔

اگر قرآن مجید فرماتا ہے: (وَأَنَّ الْمَساجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَداً[2]) ''اور مساجد سب اللہ کے لئے ہیں لہذا اس کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو''،تو اس سے مراد پرستش کے قصد سے پکارنا ہے کیونکہ زمانۂ جاہلیت کے عرب،بتوں ، ستاروں، فرشتوں، اور جنوں کی پوجا کیا کرتے تھے یہ آیت اور اس قسم کی دوسری آیتیں کسی شخص یا کسی شے کو معبود سمجھ کر پکارنے سے متعلق ہیں اور اس میں شک نہیں

[1] سورہ غافر آیت ۶۰
[2] سورہ جن آیت ۱۸

کہ ان موجودات سے اس قسم کا عقیدہ رکھتے ہوئے کسی چیز کی درخواست کرنا ان کی عبادت شمار ہوگا لیکن ان آیتوں کا کسی ایسے شخص سے دعا کرنے سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کے سلسلے میں دعا کرنے والا شخص اس کی ربوبیت یا الوہیت کا قائل نہیں ہے بلکہ اس شخص کو خدا کا بہترین اور محبوب بندہ سمجھتا ہے؟

ممکن ہے کوئی یہ تصور کرے کہ اولیائے خدا کو صرف ان کی زندگی میں پکارنا جائز ہے اور ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد انہیں پکارنا شرک ہے،اس سوال کے جواب میں ہم کہیں گے:۱۔ہم خاک میں سونے والے جسموں سے مدد نہیں مانگتے ہیں بلکہ ایسے نیک بندوں کی پاک ارواح (جیسے پیغمبرؐ اور اماموںؑ) سے مدد مانگتے ہیں جو قرآنی آیات کی صراحت کے مطابق زندہ ہیں اور شہداء سے بھی بلند وبالا مقام و منزلت کے ساتھ برزخ کی زندگی گزار رہے ہیں اور اگر ہم ان کی قبروں پر جاکر ان سے اس طرح کی درخواستیں کرتے ہیں تو یہ اس وجہ سے ہے کہ یہاں آکر ہم ان کی مقدس ارواح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ان سے رابطہ قائم کرتے ہیں اس سے بڑھ کر یہ کہ روایات کے مطابق یہ مقدس مقامات وہ ہیں جہاں دعائیں قبول ہوتی ہیں.

۲۔ان اولیائے الٰہی کا بقید حیات ہونا یا حیات سے متصف نہ ہونا شرک یا توحید کی شناخت کا معیار نہیں ہے اور ہماری گفتگو شرک اور توحید کے معیار کے بارے میں ہے لیکن ان کو پکارنا فائدہ مند ہے یا نہیں؟تو یہ ہماری گفتگو سے خارج ہے،البتہ اس مسئلے (کہ کیا اس قسم کے استغاثے فائدہ مند ہیں؟) کے بارے میں گفتگو اس کی مناسب جگہ پر موجود ہے۔

پندرہواں سوال

''بداء'' کیا ہےاور آپ اس کا عقیدہ کیوں رکھتے ہیں؟

جواب:عربی زبان میں لفظ ''بداء'' کے معنی آشکار اور ظاہر ہونے کے ہیں اسی طرح شیعہ علماء کی اصطلاح میں ایک انسان کے نیک اور پسندیدہ اعمال کی وجہ سے اس کی تقدیر و سرنوشت میں تبدیلی کو ''بداء'' کہا جاتا ہے.عقیدۂ بداء شیعیت کی آفاقی تعلیمات کے عظیم عقائد میں سے ایک ہے جسکی اساس وحی الہی اور عقلی استدلال پر استوار ہے. قرآن کریم کی نگاہ میں ایسا نہیں ہے کہ انسان کے ہاتھ اس کے مقدرات کے سامنے ہمیشہ کے لئے باندھ دیئے گئے ہوں بلکہ سعادت کی راہ اس کے لئے کھلی ہوئی ہے اور وہ راہ حق کی طرف پلٹ کر اپنے اچھے اعمال کے ذریعہ اپنی زندگی کے انجام کوبدل سکتا ہے اس حقیقت کو اس کتاب الہی نے ایک عمومی اور مستحکم اصل کے عنوان سے یوں بیان کیا ہے:(إن اللہ لایُغیّرُ ما بِقَوْمٍ حَتَّی یُغَیّرُوا ما بِأَنْفُسِہِمْ[1]) اور خداوند کسی قوم کے حالات کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے کو تبدیل نہ کرلے.اور ایک جگہ فرماتا ہے:(وَلَوْ أنَ أہْلَ الْقُرَی آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْہِمْ بَرَکَاتٍ مِن السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ[2]) اور اگر اہل قریہ ایمان لے آتے اور تقوی اختیار کر لیتے تو ہم ان کے لئے زمین اور آسمان سے برکتوں کے راستے کھول دیتے.اسی طرح حضرت یونس ؑکی سرنوشت کی تبدیلی کے بارے میں فرماتا ہے:(فَلَوْلاأَنَّہُ کَانَ مِن الْمُسَبِّحِین لَلَبِثَ فِي بَطْنِہِ إِلَی یَوْمِ یُبْعَثُون[3]) پھر اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو روز قیامت تک اسی (مچھلی) کے شکم میں رہ جاتے.اس آخری آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ظاہری اعتبار سے حضرت یونس ؑنبی کا قیامت تک اس خاص زندان میں باقی رہنا قطعی تھا لیکن ان کے نیک اعمال (تسبیح پروردگار) نے ان کی سرنوشت کوبدل دیا اور انہیں اس سے نجات دلائی.یہ

[1] سورہ رعد آیت:۱۱
[2] سورہ اعراف آیت:۹۶
[3] سورہ صافات آیت ۱۴۳اور ۱۴۴

حقیقت اسلامی روایات میں بھی بیان ہوئی ہے پیغمبر گرامیؐ اس بارے میں فرماتے ہیں ''اِن الرجل لیُحرم الرزق بالذنب یصیبہ ولا یرد القدر الا الدعاء ولا یزید فی العمر الا البرّ[1]'' بے شک انسان گناہ کی وجہ سے اپنی روزی سے محروم ہوجاتا ہے ایسے موقع پر دعا کے علاوہ کوئی اور چیز اس کی تقدیر کو تبدیل نہیں کرسکتی اور نیکی کے علاوہ کوئی اور چیز اس کی عمر کو نہیں بڑھا سکتی یہ اور اس قسم کی دوسری روایتوں سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ انسان گناہ کی بدولت روزی سے محروم ہو جاتا ہے ؛ لیکن اپنے نیک اعمال (جیسے دعا مانگنے) کے ذریعہ اپنی سرنوشت کو بدل سکتا ہے اور نیکی کر کے اپنی عمر بڑھا سکتا ہے۔

نتیجہ: قرآنی آیات اور سنت پیغمبرؐ سے استفادہ ہوتا ہے کہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس مادی دنیا کے اسباب و مسببات اور کاموں کے ردعمل سے بھی تقدیر بدل جاتی ہے یا اولیائے خدا (جیسے نبی یاامام) انسان کو خبر دے کہ اگر اس کا طرز عمل اسی طرح رہا تو اس کا مقدر یہ ہوگا لیکن اگر وہ یکبارگی کسی وجہ سے اپنے کردار کو سنوار لے تو اپنی عاقبت کوتبدیل کرسکتا ہے۔

اس حقیقت کو خدا کی وحی، پیغمبر اسلامؐ کی سنت اور عقل سلیم کے فیصلوں سے درس لے کر حاصل کیا گیا ہے۔ اوراسے شیعہ علماء بداء کے نام سے یاد کرتے ہیں یہاں پر اس بات کا واضح کردینا مناسب ہوگا کہ ''بداء'' کی تعبیر عالم تشیع سے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ تعبیر پیغمبر اکرمؐ کی احادیث اور اہل سنت کی تحریروں میں بھی دکھائی دیتی ہے نمونے کے طور پر ذیل کی حدیث ملاحظہ ہو جس میں پیغمبر اکرمؐ نے اس کلمہ کو استعمال فرمایا ہے ''وبدااللہ عزّ وجلّ أن یبتلیھم[2]'' اس نکتے کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ بداء کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خداوند کریم کے لامتناہی علم میں کسی قسم کی تبدیلی رونما ہوتی ہے کیونکہ خداوند کریم ابتداء ہی سے انسانی افعال کے فطری نتائج اور بدا کا موجب بننے والے عوامل سے بخوبی آگاہ ہے اس بات کی قرآن مجید نے بھی خبر دی ہے۔(یَمْحُوا اللہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ وَعِندَہُ أُمُّ الْکِتَابِ[3]) اللہ جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے یا برقرار رکھتا ہے کہ اصل کتاب اسی کے پاس ہے۔لہذا خداوند کریم ظہور بداء کے وقت اس حقیقت کو ہمارے لئے آشکار کرتا ہے جو ازل ہی سے اس کے علم میں تھی اسی وجہ سے امام صادق ۔

[1] مسند احمد جلد ۵ ص ۲۷۷ او رمستدرک حاکم جلد ۱ ص ۴۹۳ اور اسی کی مثل ''التاج الجامع للاصول '' جلد ۵ ص ۱۱۱ میں ہے۔
[2] النہایہ فی غریب الحدیث والاثر ، مؤلف مجدالدین مبارک بن محمد جزری جلد۱ ص ۱۰۹
[3] سورہ رعد آیت: ۳۹

فرماتے ہیں''ما بدا اللہ في شيء الا کان في علمہ قبل أن يبدو لہ[1]''خداوند عالم کو کسی چیز میں بداء نہیں ہوتا ہے مگر یہ کہ ازل سے اس کو اس کا علم تھا.

بداء کا فلسفہ

اس میں شک نہیں کہ اگر انسان یہ جان لے کہ تقدیر کو بدلنا اس کے اختیار میں ہے تو وہ ہمیشہ اپنے مستقبل کو سنوارنے کے درپے رہے گا اور زیادہ سے زیادہ ہمت اور کوشش کے ساتھ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرے گا. دوسرے لفظوں میںیہ کہا جائے کہ جس طرح توبہ اور شفاعت انسان کو ناامیدی اور مایوسی سے نجات دلاتی ہے اسی طرح بداء کا عقیدہ بھی انسان کے اندر نشاط اور شادابی پیدا کرتا ہے اور انسان کو روشن مستقبل کا امیدوار بناتا ہے کیونکہ اس عقیدے کی روشنی میں انسان یہ جان لیتا ہے کہ پروردگار عالم کے حکم سے وہ اپنی تقدیر کو بدل سکتا ہے اور ایک بہتر مستقبل حاصل کرکے اپنی عاقبت سنوار سکتا ہے۔

[1] اصول کافی جلد ۱ کتاب التوحید باب البداء حدیث نمبر ۹

سولهواں سوال

کیا شیعہ قرآن مجید میں تحریف کے قائل ہیں؟

جواب: شیعوں کے مشہور علماء کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن مجید میں کسی بھی قسم کی تحریف نہیں ہوئی ہے اور وہ قرآن جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے بعینہ وہی آسمانی کتاب ہے جو پیغمبر گرامی [ص]پر نازل ہوئی تھی اور اس میں کسی قسم کی زیادتی اور کمی نہیں ہوئی ہے اس بات کی وضاحت کے لئے ہم یہاں چند شواہد کی طرف اشارہ کرتے ہیں:۱۔پروردگار عالم مسلمانوں کی آسمانی کتاب کی صیانت اور حفاظت کی ضمانت لیتے ہوئے فرماتا ہے: (إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَإِنَّا لَہُ لَحَافِظُون [1]) ہم نے ہی اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں.واضح ہے کہ ساری دنیا کے شیعہ چونکہ قرآن مجید کو اپنے افکار اور کردار کے لئے اساس قرار دیتے ہیں لہذا اس آیہ شریفہ کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے اس آیت میں موجود اس پیغام پر کامل ایمان رکھتے ہیں جو اس کتاب خدا کی حفاظت سے متعلق ہے.

۲۔شیعوں کے عظیم الشأن امام حضرت علی ـ نے جو ہمیشہ پیغمبر اکرم [ص]کے ہمراہ رہے اور کاتبان وحی میں سے ایک تھے آپ سے لوگوں کو مختلف موقعوں اور مناسبتوں پر اسی قرآن کی طرف دعوت دی ہے ہم اس سلسلے میں ان کے کلام کے کچھ حصے یہاں پیش کرتے ہیں ''؛واعلموا أن ھذا القرآن ھو الناصح الذي لایغش والھادي الذي لایضلّ [2]''جان لوکہ یہ قرآن ایسا نصیحت کرنے والا ہے جو ہرگز خیانت نہیں کرتا اور ایسا رہنمائی کرنے والا ہے جو ہرگز گمراہ نہیں کرتا ''؛إن اللہ سبحانہ لم یعط أحداً بمثل ھذا القرآن فإنہ حبل اللہ المتین و سببہ المبین [3]'' بے شک خداوند سبحان نے کسی بھی شخص کو اس قرآن کے جیسی نصیحت عطا نہیں فرمائی ہے کہ یہی

---

[1] سورہ حجر آیت :۹

[2] نہج البلاغہ (صبحی صالح) خطبہ نمبر ۱۷۶

[3] گذشتہ حوالہ.

خدا کی محکم رسی اور اس کا واضح وسیلہ ہے'' ثم أنزل علیہ الکتاب نورًا لا تطفأ مصابیحہ و سراجًا لا یخبو توقدہ ومنھاجًا لا یضل نھجہ ... و فرقانا لا یخمد برھانہ[1] ''اور پھر آپؐ پر ایسی کتاب کو نازل کیا جس کا نور کبھی خاموش نہیں ہوگا اور جس کے چراغ کی لو کبھی مدھم نہیں پڑ سکتی وہ ایسا راستہ ہے جس پر چلنے والا کبھی بھٹک نہیں سکتا اور ایسا حق اور باطل کا امتیاز ہے جو کمزور نہیں پڑ سکتا. شیعوں کے امام عالی شان امام حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب ـ کے گہربار کلام سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن مجید کی مثال ایک ایسے روشن چراغ کی ہے جو ہمیشہ اپنے پیروکاروں کے لئے مشعل راہ کا کام کرے گا. اور ساتھ ہی ساتھ اس میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں ہوگی جو اس کے نور کے خاموش ہوجانے یا انسانوں کی گمراہی کا باعث ہو.

۳ـ شیعہ علماء اس بات پر اتفاق نظر رکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام [ص] نے یہ ارشاد فرمایا ہے'' : میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جارہا ہوں ایک کتاب خدا (قرآن) ہے اور دوسرے میرے اہل بیت ہیں جب تک تم ان دو سے متمسک رہوگے ہرگز گمراہ نہیں ہوگے''. یہ حدیث اسلام کی متواتر احادیث میں ایک ہے جسے شیعہ اور سنی دونوں فرقوں نے نقل کیا ہے. اس بیان سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ شیعوں کی نظر میں کتاب خدا میں ہرگز کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوسکتی کیونکہ اگر قرآن مجید میں تحریف کا امکان ہوتا تو اس سے تمسک اختیار کر کے ہدایت حاصل کرنا اور گمراہی سے بچنا ممکن نہ ہوتا اور پھر اس کے نتیجہ میں قرآن اور حدیث ثقلین کے درمیان ٹکراؤ ہوجاتا.

۴. شیعوں کے اماموں نے اپنی روایات میں (جنہیں ہمارے تمام علماء اور فقہا نے نقل کیا ہے) اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ قرآن مجید حق وباطل اور صحیح و غلط کے درمیان فرق پیدا کرنے والا ہے لہذا ہر کلام حتی ہم تک پہنچنے والی روایات کے لئے ضروری ہے کہ انہیں قرآن مجید کے میزان پر تولا جائے اگر وہ قرآنی آیات کے مطابق ہوں تو حق ہیں ورنہ باطل. اس سلسلے میں شیعوں کی فقہ اور احادیث سے متعلق کتابوں میں بہت سی روایتیں ہیں ہم یہاں ان میں سے صرف ایک روایت کو پیش کرتے ہیں: امام صادق ـ

[1] نہج البلاغہ (صبحی صالح) خطبہ نمبر ۱۹۸

فرماتے ہیں'' :مالم یوافق من الحدیث القرآن فھو زخرف[1]''ہر وہ کلام باطل ہے جو قرآن سے مطابقت نہ رکھتا ہو. اس قسم کی روایات سے بھی یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن مجید میں کسی بھی قسم کی تحریف نہیں کی جاسکتی اسی وجہ سے اس کتاب کی یہ خاصیت ہے کہ وہ حق و باطل میں فرق پیدا کرنے والی ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے.

۵.شیعوں کے بزرگ علماء نے ہمیشہ اسلام اور تشیع کی آفاقی تہذیب کی حفاظت کی ہے ان سب نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ قرآن مجید میں کبھی کوئی تحریف نہیں ہوئی ہے چوں کہ ان تمام بزرگوں کے نام تحریر کرنا دشوار کام ہے لہذا ہم بطور نمونہ ان میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں: ۱۔جناب ابوجعفر محمد بن علی بن حسین بابویہ قمی (متوفی ۳۸۱ھ) جو ''شیخ صدوق'' کے نام سے مشہور ہیں فرماتے ہیں '' : قرآن مجید کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ خدا کا کلام ہے وہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں باطل نہیں آسکتا وہ پروردگار حکیم و علیم کی بارگاہ سے نازل ہوا ہے اور اسی کی ذات اس کو نازل کرنے اور اس کی محافظت کرنے والی ہے [2].''

۲۔جناب سید مرتضیٰ علی بن حسین موسوی علوی (متوفی ۴۳۶ھ)جو ''علم الہدیٰ'' کے نام سے مشہور ہیں فرماتے ہیں '' :پیغمبر اکرم [ص] کے بعض صحابۂ کرام جیسے عبداللہ بن مسعود اور اُبیّ بن کعب وغیرہ نے بارہا آنحضرت [ص] کے حضور میں قرآن مجید کو اول سے لے کر آخر تک پڑھا ہے یہ بات اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ قرآن مجید ترتیب کے ساتھ اور ہر طرح کی کمی یا پراگندگی کے بغیر اسی زمانے میں جمع کرکے مرتب کیا جاچکا تھا [3].''

۳۔جناب ابوجعفر محمد بن حسن طوسی (متوفی ۴۶۰ھ)جوکہ شیخ الطائفہ کے نام سے مشہور تھے وہ فرماتے ہیں'' :قرآن مجید میں کمی یا زیادتی کا نظریہ کسی بھی اعتبار سے اس مقدس کتاب کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ تمام مسلمان اس بات پر اتفاق نظر رکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں کسی طرح کی زیادتی واقع نہیں ہوئی ہے اسی طرح ظاہراً سارے مسلمان متفق ہیں کہ قرآن مجید میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی ہے اور یہ نظریہ کہ (قرآن میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی ہے) ہمارے مذہب سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے جناب سید

---

[1] اصول کافی جلد۱ کتاب فضل العلم باب الاخذ بالسنۃ و شواہد الکتاب روایت نمبر ۴

[2] الاعتقادات ص ۹۳

[3] مجمع البیان جلد۱ ص ۱۰ میں سید مرتضیٰ کی کتاب ''المسائل الطر ابلیسیات''سے نقل کرتے ہوئے.

مرتضیؒ نے بھی اس بات کی تائید کی ہے اور روایات کے ظاہری مفہوم سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کچھ لوگوں نے بعض ایسی روایتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں قرآن مجید کی آیات میں کمی یا ان کے جا بجا ہوجانے کا ذکر ہے ایسی روایتیں شیعہ اور سنی دونوں ہی کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ روایتیں خبر واحد ہیں ان سے نہ تو یقین حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی ان پر عمل کیا جاسکتا ہے[1]۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ اس قسم کی روایتوں سے روگردانی کی جائے[2]۔

۴۔جناب ابوعلی طبرسی صاحب تفسیر ''مجمع البیان'' فرماتے ہیں'' :پوری امت اسلامیہ اس بات پر متفق ہے کہ قرآن مجید میں کسی بھی قسم کا اضافہ نہیں ہوا ہے اس کے برخلاف ہمارے مذہب کے کچھ افراد اور اہل سنت کے درمیان ''حشویہ'' فرقہ کے ماننے والے قرآن مجید کی آیات میں کمی کے سلسلے میں بعض روایتوں کو پیش کرتے ہیں لیکن جس چیز کو ہمارے مذہب نے مانا ہے جو صحیح بھی ہے وہ اس نظریہ کے برخلاف ہے[3]۔''

۵۔جناب علی بن طاؤس حلی (متوفی ۶۶۴ھ) جو ''سید بن طاؤس'' کے نام سے مشہور ہیں فرماتے ہیں'': شیعوں کی نگاہ میں قرآن مجید میں کسی بھی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے[4]''

۶۔ جناب شیخ زین الدین عاملی (متوفی ۸۷۷ھ) اس آیہ کریمہ: (إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ'' :یعنی ہم قرآن مجید کو ہر قسم کی تبدیلی اور زیادتی سے محفوظ رکھیں گے[5]۔''

۷۔کتاب احقاق الحق کے مؤلف سید نور اللہ تستری (شہادت ۱۰۱۹ھ) جو کہ شہید ثالث کے لقب سے مشہور ہیں فرماتے ہیں'': بعض لوگوں نے شیعوں کی طرف یہ نسبت دی ہے کہ وہ قرآن میں تبدیلی کے قائل ہیں لیکن یہ سارے شیعوں کا عقیدہ نہیں ہے بلکہ ان میں سے بہت تھوڑے سے افراد ایسا عقیدہ رکھتے ہیں اور ایسے افراد شیعوں کے درمیان مقبول نہیں ہیں[6]۔''

---

[1] ایسی روایت جو حد تواتر تک نہ پہنچتی ہو اور اس کے صدق کا یقین بھی نہ کیا جاسکتا ہووہ خبر واحد کہلاتی ہے۔(مترجم)
[2] تفسیر تبیان جلد ۱ ص ۳.
[3] تفسیر مجمع البیان جلد ۱ ص ۱۰.
[4] سعد السعود ص ۱۱۴۴
[5] اظہار الحق ج۲ ص ۱۳۰
[6] آلاء الرحمن ص ۲۵

۸ ۔جناب محمد بن حسین (متوفی ۱۰۳۰ھ)جو ''بہاء الدین عاملی '' کے نام سے مشہور ہیں فرماتے ہیں کہ '': صحیح یہ ہے کہ قرآن مجید ہر قسم کی کمی و زیادتی سے محفوظ ہے اور یہ کہنا کہ امیر المومنین علی ۔ کا نام قرآن مجید سے حذف کردیا گیا ہے'' ایک ایسی بات ہے جو علماء کے نزدیک ثابت نہیں ہے جو شخص بھی تاریخ اور روایات کا مطالعہ کرے گا اس کو معلوم ہوجائے گا کہ قرآن مجید متواتر روایات اور پیغمبر اکرمؐ کے ہزاروں اصحاب کے نقل کرنے کی وجہ سے ثابت و استوار ہے اور پیغمبر اکرم [ص] کے زمانے میں ہی پورا قرآن جمع کیا جاچکا تھا!''

۹ ۔کتاب وافی کے مؤلف جناب فیض کاشانی (متوفی ۱۰۹۱ھ) نے آیت (إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ)کو اور اس جیسی آیتوں کو قرآن مجید میں عدم تحریف کی دلیل قرار دیتے ہوئے یوں لکھا ہے '':اس صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن مجید میں تحریف واقع ہو ساتھ ہی ساتھ تحریف پر دلالت کرنے والی روایتیں کتاب خدا کی مخالف بھی ہیں لہذا ضروری ہے کہ اس قسم کی روایات کو باطل سمجھا جائے[2]''

۱۰۔جناب شیخ حر عاملی (متوفی ۱۱۰۴ھ) فرماتے ہیں کہ '': تاریخ اور روایات کی چھان بین کرنے والا شخص اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ قرآن مجید، متواتر روایات اور ہزاروں صحابہ کرام کے نقل کرنے سے ثابت و محفوظ رہا ہے اور یہ قرآن پیغمبر اکرم [ص] کے زمانے میں ہی منظم صورت میں جمع کیا جاچکا تھا[3]''

۱۱۔بزرگ محقق ''جناب کاشف الغطاء'' اپنی معروف کتاب ''کشف الغطاء'' میں لکھتے ہیں '':اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید خداوندکریم کی صیانت و حفاظت کے سائے میں ہر قسم کی کمی و تبدیلی سے محفوظ رہا ہے اس بات کی گواہی خود قرآن مجید بھی دیتا ہے اور ہرزمانے کے علماء نے بھی یک زبان ہو کر اس کی گواہی دی ہے اس سلسلے میں ایک مختصر سے گروہ کا مخالفت کرنا قابل اعتناء نہیں ہے''.

---

[1] آلاء الرحمن ص ۲۵
[2] تفسیر صافی جلد ۱ ص ۵۱
[3] آلاء الرحمن ص ۲۵

۱۲۔اس سلسلہ میں انقلاب اسلامی کے رہبر حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان بھی موجود ہے جسے ہم ایک واضح شاہد کے طور پر پیش کرتے ہیں:ہر وہ شخص جو قرآن مجید کے جمع کرنے اس کی حفاظت کرنے، اس کو حفظ کرنے ، اس کی تلاوت کرنے اور اس کے لکھنے کے بارے میں مسلمانوں کی احتیاط سے آگاہی رکھتا ہو وہ قرآن کے سلسلے میں نظریہ تحریف کے باطل ہونے کی گواہی دے گا اور وہ روایات جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں وہ یا تو ضعیف ہیں جن کے ذریعے استدلال نہیں کیا جاسکتا یا پھر مجہول ہیں جس سے ان کے جعلی ہونے کی نشاندہی ہوتی ہے یا یہ روایتیں قرآن کی تاویل اور تفسیر کے بارے میں ہیں یا پھر کسی اور قسم کی ہیں جن کے بیان کے لئے ایک جامع کتاب تالیف کرنے کی ضرورت ہے اگر موضوع بحث سے خارج ہونے کا خدشہ نہ ہوتا تو یہاں پر ہم قرآن کی تاریخ بیان کرتے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح کرتے کہ ان چند صدیوں میں اس قرآن پر کیسے حالات گزرے ہیں اور اس بات کو بھی روشن کردیتے کہ جو قرآن مجید آج ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ بعینہ وہی آسمان سے آنے والی کتاب ہے اور وہ اختلاف جو قرآن کے قاریوں کے درمیان پایا جاتا ہے وہ ایک جدید امر ہے جس کا اس قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے جسے لے کر جبرئیل امین ۔ پیغمبر [ص]کے قلب مطہر پر نازل ہوئے تھے[1]''

نتیجہ:مسلمانوں کی اکثریت خواہ وہ شیعہ ہوں یا سنی اس بات کی معتقد ہے کہ یہ آسمانی کتاب بعینہ وہی قرآن ہے جو پیغمبر خدا [ص]پر نازل ہوئی تھی اور وہ ہر قسم کی تحریف ، تبدیلی ، کمی اور زیادتی سے محفوظ ہے،ہمارے اس بیان سے شیعوں کی طرف دی جانے والی یہ نسبت باطل ہوجاتی ہے کہ وہ قرآن میں تحریف کے قائل ہیں اگر اس تہمت کا سبب یہ ہے کہ چند ضعیف روایات ہمارے ہاں نقل ہوئی ہیں تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ ان ضعیف روایات کو شیعوں کے ایک مختصر فرقے ہی نے نہیں بلکہ اہل سنت کے بہت سے مفسرین نے بھی اپنے ہاں نقل کیا ہے یہاں ہم نمونے کے طور پر ان میں سے بعض روایات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ابوعبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی اپنی تفسیر میں ابوبکر انبازی سے اور نیزابی بن کعب سے روایت کرتے ہیں کہ سورہ احزاب

[1] تہذیب الاصول ، جعفر سبحانی(دروس امام خمینی قدس سره)جلد۲ص۹۶

(جس میں تہتر آیتیں ہیں) پیغمبر [ص]کے زمانے میں سورہ بقرہ (جس میں دو سو چھیاسی آیتیں ہیں) کے برابر تھا اور اسوقت اس سورہ میں آیہ ''رجم'' بھی شامل تھی[1]. (لیکن اب سورہ احزاب میں یہ آیت نہیں ہے)اور نیز اس کتاب میں عائشہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا '': پیغمبر [ص]کے زمانے میں سورۂ احزاب میں دو سو آیتیں تھیں پھر بعد میں جب مصحف لکھا گیا تو جتنی اب اس سورہ میں آیتیں ہیں ان سے زیادہ نہ مل سکیں[2]''

۲۔کتاب ''الاتقان'' کے مؤلف نقل کرتے ہیں کہ ''اُبیّ '' کے قرآن میں ایک سو سولہ سورے تھے کیونکہ اس میں دو سورے حفد اور خلع بھی تھے .جب کہ ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید کے سوروں کی تعداد ایک سو چودہ ہے اور ان دو سوروں (حفد اور خلع) کا قرآن مجید میں نام ونشان تک نہیں ہے[3].

۳۔ہبۃ اللہ بن سلامہ اپنی کتاب ''الناسخ والمنسوخ'' میں انس بن مالک سے نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں : ''پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں ہم ایک ایسا سورہ پڑھتے تھے جو سورۂ توبہ کے برابر تھامجھے اس سورہ کی صرف ایک ہی آیت یاد ہے اور وہ یہ ہے '':لوأن لابن آدم وادیان من الذھب لابتغیٰ اِلیھما ثالثاً ولو أن لہ ثالثاً لابتغیٰ اِلیھا رابعاً ولا یملأ جوف ابن آدم اِلا التراب ویتوب اللہ علیٰ مَن تاب''! جب کہ ہم سب جانتے ہیں کہ اس قسم کی آیت قرآن میں موجود نہیں ہے اور یہ جملے قرآنی بلاغت سے بھی مغایرت رکھتے ہیں.

۴۔جلال الدین سیوطی اپنی تفسیر در المنثور میں عمر بن خطاب سے روایت کرتے ہیں کہ سورہ احزاب سورہ بقرہ کے برابر تھا اور آیہ ''رجم'' بھی اس میں موجود تھی[4]لہذا شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کے کچھ افراد نے قرآن میں تحریف کے بارے بلکہ قرآن کی آیتوں، عالم اسلام کی صحیح اور متواتر روایتوں،اجماع، ہزاروں اصحاب پیغمبرؐ کے نظریات اور دنیا کے تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید میں کسی بھی قسم کی تحریف،تبدیلی، کمی یازیادتی نہ آج تک ہوئی ہے اور نہ ہی رہتی دنیا تک ہوگی۔

---

[1] تفسیر قرطبی جز ۱۴ ص ۱۱۳ سورہ احزاب کی تفسیر کی ابتداء میں.
[2] گذشتہ حوالہ
[3] اتقان جلد ۱ ص ۶۷.
[4] تفسیر درالمنثور جلد ۵ ص ۱۸۰ سورہ احزاب کی تفسیر کی ابتداء میں میں ایسی ضعیف روایتوں کو نقل کیا ہے جنہیں مسلمانوں کی اکثریت نے خواہ وہ شیعہ ہوں یا سنی قبول نہیں کیا ہے.

سترہواں سوال

صحابۂ کرام کے بارے میں شیعوں کا کیا نظریہ ہے؟

جواب: شیعوں کے نزدیک پیغمبر خدا [ص] کو دیکھنے اور انکی مصاحبت سے شرفیاب ہونے والے افراد چند گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں لیکن اس بات کی وضاحت سے قبل بہتر یہ ہے کہ لفظ ''صحابی'' کو واضح کردیا جائے صحابی پیغمبرؐ کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں یہاں ہم ان میں سے بعض تعریفوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں: ١۔ سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ: ''صحابی'' وہ ہے جو ایک یا دو سال تک پیغمبر خدا[1] کی خدمت میں رہا ہو اور اس نے آنحضرتؐ کی ہمراہی میں ایک یا دو جنگیں بھی لڑی ہوں!

٢۔ واقدی کہتے ہیں کہ: علماء کے نزدیک ہر وہ شخص رسولؐ کا صحابی شمار ہوتا ہے جس نے آنحضرتؐ کو دیکھا ہو اور اسلام کی طرف مائل ہو اور اس نے دین اسلام کے سلسلے میں غور و فکر کرنے کے بعد اسے قبول کرلیا ہو اگرچہ وہ گھنٹہ بھر ہی آنحضرتؐ کے ہمراہ رہا ہو[2]۔

٣۔ محمد بن اسماعیل بخاری کہتے ہیں کہ: مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص جو آنحضرتؐ کی مصاحبت میں رہا ہو یا اس نے آپؐ کو دیکھا ہو وہ آنحضرتؐ کے اصحاب میں شمار ہوگا[3]۔

٤۔ احمد ابن حنبل کہتے ہیں کہ: ہر وہ شخص جو ایک ماہ یا ایک دن یا چند گھڑیاں پیغمبر اکرمؐ کے ہمراہ رہا ہو یا اس نے آنحضرتؐ کو دیکھا ہو وہ ان کے اصحاب میں شمار ہوگا[4]۔ علمائے اہل سنت کے نزدیک ''عدالت صحابہ'' ایک متفق علیہ مسئلہ ہے اس کے طابق

[1] اسد الغابۃ جلد١ ص ١١ ، ١٢ طبع مصر
[2] گذشتہ حوالہ
[3] اسدالغابۃ جلد١ ص ١١ ، ١٢
[4] گذشہ حوالہ

جس شخص کو بھی پیغمبر اکرمؐ کی مصاحبت حاصل ہوئی ہو وہ عادل ہے!یہاں پر ضروری ہے کہ اس نظریہ کا قرآنی آیات کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس بارے میں وحی الہی کے سرچشمہ سے حاصل شدہ شیعوں کے نکتہ نظر کا بھی تذکرہ کیا جائے ۔

تاریخ نے بارہ ہزار سے زیادہ افراد کے نام اصحاب پیغمبرؐ کی فہرست میں درج کئے ہیں جنکے درمیان مختلف قسم کے چہرے دکھائی پڑتے ہیں بے شک آنحضرتؐ کی مصاحبت ایک بہت بڑا افتخار تھا جو صرف چند افراد ہی کو نصیب ہوا اور امت اسلامی نے ہمیشہ ایسے افراد کو ادب و احترام کی نگاہوں سے دیکھا ہے کیونکہ انہی بزرگان نے آئین اسلام کی نمائندگی کرتے ہوئے سب سے پہلے اسلام کی عزت اور شوکت کے پرچم کو لہرایا ہے.قرآن مجید نے بھی ان کی تعریف کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے:(لایَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُوْلٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا [2]) اور تم میں سے فتح سے پہلے انفاق کرنے والا اور جہاد کرنے والا اس کے جیسا نہیں ہوسکتا جو فتح کے بعد انفاق اور جہاد کرے پہلے جہاد کرنے والے کا درجہ بہت بلند ہے.

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا اعتراف بھی کرلینا چاہئے کہ پیغمبر خداؐ کی مصاحبت کوئی ایسا کیمیاوی نسخہ نہیں تھا جو انسانوں کی حقیقت کو بدل دیتا اور عمر کے آخری حصے تک ان کی زندگی کی ضمانت لیتا نیز انہیں ہمیشہ کے لئے عادلوں کی صف میں کھڑا کردیتا .

اس مسئلے کی وضاحت کے لئے بہتر یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے درمیان قابل اعتماد کتاب قرآن مجید کا مطالعہ کریں اور اس سلسلے میں اس سے مدد حاصل کریں.

صحابی قرآن مجید کی نگاہ میں

قرآن کے نکتہ نظر سے نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہونے اور آپؐ کی مصاحبت اختیار کرنے والوں کی دو قسمیں ہیں:پہلی قسم وہ ایسے اصحاب ہیں جن کی قرآن مجید کی آیتیں مدح و ستائش کرتی ہیں اور انہیں شوکت اسلام کا بانی قرار دیتی ہیں یہاں پر ہم صحابہ کرام کے ایسے گروہ سے متعلق چند آیتوں کا ذکر کرتے ہیں:ا۔دوسروں پر سبقت لے جانے والے(وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ

[1] الاستعیاب فی اسماء الاصحاب جلد١ ص٢ ''الاصابۃ'' کے حاشیے میں اسدالغابۃ جلد١ صفحہ ٣ میں ابن اثیر سے نقل کرتے ہوئے.
[2] سورہ حدید آیت: ١٠

المُہاجِرِین وَالأَنصَارِ وَالَّذِین اتَّبَعُوہُم بِإِحسَانٍ رَضِيَ اللہُ عَنہُم وَرَضُوا عَنہُ وَأَعَدَّ لَہُم جَنَّاتٍ تَجرِي مِن تَحتِہَا الأَنہارُ خَالِدِین فِیہَا أَبَدًا ذٰلِکَ الفَوزُ العَظِیمُ[1]) اور مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے اور جن لوگوں نے نیکی میں ان کا اتباع کیا ہے ان سب سے خدا راضی ہوگیا ہے اور یہ سب خدا سے راضی ہیں اور خدا نے ان کے لئے وہ باغات مہیا کئے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور یہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے.

۲۔درخت کے نیچے بیعت کرنے والے(لَقَد رَضِيَ اللہُ عَنِ المُؤمِنِین إِذ یُبَایِعُونَکَ تَحتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِہِم فَأَنزَلَ السَّکِینَۃَ عَلَیہِم وَأَثَابَہُم فَتحًا قَرِیبًا[2]) یقیناً خدا صاحبان ایمان سے اس وقت راضی ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کررہے تھے پھر اس نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جوان کے دلوں میں تھا تو ان پر سکون نازل کردیا اور انہیں اس کے عوض قریبی فتح عنایت کردی .

۳۔مہاجرین(لِلفُقَرَاءِ المُہَاجِرِین الَّذِین أُخرِجُوا مِن دِیارِہِم وَأَموَالِہِم یَبتَغُون فَضلًا مِن اللہِ وَرِضوَانًا وَیَنصُرُون اللہَ وَرَسُولَہُ أُولٰئِکَ ہُمُ الصَّادِقُون[3]) یہ مال ان مہاجر فقراء کے لئے بھی ہے جنہیں ان کے گھروں سے نکال دیا گیا اور ان کے اموال سے انہیں دور کردیا گیا اور وہ صرف خدا کے فضل اور اس کی مرضی کے طلب گار ہیں اور خدا اور رسول کی مدد کرنے والے ہیں یہی لوگ دعوائے ایمان میں سچے ہیں.

۴۔اصحاب فتح (مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللہِ وَالَّذِین مَعَہُ أَشِدَّاءُ عَلَی الکُفَّارِ رُحَمَاءُ بَینَہُم تَرَاہُم رُکَّعًا سُجَّدًا یَبتَغُون فَضلًا مِن اللہِ وَرِضوَانًا سِیمَاہُم فِي وُجُوہِہِم مِن أَثَرِ السُّجُودِ[4]) محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لئے سخت ترین اور آپس میں انتہائی رحم دل ہیں تم ان کودیکھوگے کہ بارگاہ احدیت میں سرخم کئے ہوئے سجدہ ریز ہیں اور اپنے پروردگار سے فضل وکرم اور اس کی خوشنودی کے طلب گار ہیں کثرت سجود کی وجہ سے ان کے چہروں پر سجدہ کے نشانات پائے جاتے ہیں.دوسری قسم بزم رسالت میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جنہیں پیغمبر خداؐ کی مصاحبت تو حاصل ہوئی تھی مگر وہ یا تو منافق تھے یا پھر ان کے دل میں مرض تھا قرآن مجید نے پیغمبر

---

[1] سورہ توبہ آیت:۱۰۰
[2] سورہ فتح آیت:۱۸
[3] سورہ حشر آیت:۸
[4] سورہ فتح آیت:۲۹

اسلامؑ کے لئے ایسے افراد کی حقیقت کو نمایاں کیا ہے اور آنحضرتؐ کو یہ تاکید کی ہے کہ ان سے محتاط رہیں یہاں پر ہم اس سلسلے میں نازل ہونے والی آیتوں کے چند نمونے پیش کرتے ہیں: ا۔ معروف منافقین (إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ[١]) اے پیغمبر! یہ منافقین آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ بھی جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں.

٢۔ غیر معروف منافقین (وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ[٢]) اور تم لوگوں کے گرد، دیہاتیوں میں بھی منافقین ہیں اور اہل مدینہ میں تو وہ بھی ہیں جو نفاق میں ماہر اور سرکش ہیں تم لوگ ان کو نہیں جانتے ہو لیکن ہم خوب جانتے ہیں.

٣۔ دل کے کھوٹے (وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا[٣]) اور جب منافقین اور جن کے دلوں میں مرض تھا یہ کہہ رہے تھے کہ خدا اور رسول نے ہم سے صرف دھوکا دینے والا وعدہ کیا ہے.

٤۔ گناہ گار (وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ[٤]) اور دوسرے وہ لوگ جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا کہ انہوں نے نیک اور بد اعمال مخلوط کردئیے ہیں عنقریب خدا ان کی توبہ قبول کرلے گا وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے. قرآن مجید کی آیات کے علاوہ پیغمبر اکرمؐ سے بھی بعض صحابہ کی مذمت میں بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں ان میں سے ہم صرف دو روایتوں کو بطور نمونہ پیش کرتے ہیں : ا۔ ابو حازم، سہل بن سعد سے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر خداؐ نے ارشاد فرمایا ''؛ أنا فرطكم علىٰ الحوض مَن ورد شرب و مَن شرب لم يظمأ أبداً و ليردن عليّ أقوام أعرفهم و يعرفوني ثم يحال بيني و بينهم ''.میں تم سب کو حوض کی طرف بھیجوں گا جو شخص بھی اس حوض تک پہنچے گا وہ اس میں سے ضرور پیئے گا اور جو بھی اس سے

[١] سورہ منافقون آیت:١
[٢] سورہ توبہ آیت: ١٠١
[٣] سورہ توبہ آیت : ١٠٢.
[٤] سورہ توبہ آیت : ١٠٢.

پئے گا پھر وہ تا ابد پیاس محسوس نہیں کرے گا پھر ایک گروہ میرے پاس آئے گا جسے میں اچھی طرح پہچانتا ہوں گا اور وہ بھی مجھے پہچانتے ہوں گے اس کے بعد ان لوگوں کو مجھ سے جدا کردیا جائے گا''.ابو حازم کا بیان ہے کہ جس وقت میں نے نعمان ابن ابی عیاش کے سامنے یہ حدیث پڑھی تو انہوں نے مجھ سے کہا: کیا تم نے یہ حدیث سھل سے اسی طرح سنی ہے ؟ میں نے کہا ہاں اس وقت نعمان بن ابی عیاش نے کہا کہ ابوسعید خدری نے بھی اس حدیث کو ان کلمات کے اضافے کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں'': اِنھم مني فيقال: إنک لاتدري ما أحدثوا بعدک فأقول سحقا سحقا لمن بدل بعدي[1]''یہ افراد مجھ سے ہیں پس کہا جائے گا کہ آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کام انجام دیئے ہیں !پس میں کہوں گا ایسے لوگوں سے خدا کی رحمت دور ہوجائے جنہوں نے میرے بعد (احکام دین میں)تبدیلی کی۔

پیغمبر اسلامؐ کی اس حدیث میں ان دو جملوں'' جنہیں میں اچھی طرح پہچانتا ہوں گا اور وہ سب بھی مجھے پہچانتے ہونگے ''اور ''میرے بعد تبدیلی کی'' سے صاف واضح ہے کہ آنحضرتؐ کی مراد آپکے وہ اصحاب ہیں جو کچھ مدت آنحضرتؐ کے ہمراہ رہے ہیں (اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے بھی نقل کیا ہے)۔

۲۔ بخاری اور مسلم پیغمبر خداؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے'':یرد عليَّ یوم القیامة رهط من أصحابي أو قال من أمتي فيحلون عن الحوض فأقول یارب أصحابي فيقول اِنہ لاعلم لک بما أحدثوا بعدک أنھم ارتدوا علیٰ أدبارھم القھقری[2]''قیامت کے دن میرے اصحاب میں سے یا فرمایا میری امت میں سے ایک گروہ میرے پاس آئے گاپس ان کو حوض کوثر سے دور کردیا جائے گا اس وقت میں کہوں گا اے میرے پروردگار!یہ میرے اصحاب ہیں تو خدا فرمائے گا آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیسے کیسے کام انجام دئیے ہیں بے شک یہ لوگ اپنی سابقہ حالت (زمانہ جاہلیت) پر لوٹ کر مرتد ہوگئے تھے.

---

[1] جامع الاصول (ابن اثیر) جلد ١١ کتاب الحوض فی ورود الناس علیہ ص ١٢٠ حدیث نمبر ٧٩٧٢.
[2] جامع الاصول جلد ١١ ص ١٢٠ حدیث ٧٩٧٣

نتیجہ:قرآنی آیات اور سنت پیغمبر[ص]کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اصحاب اور وہ افراد جنہیں آنحضرتؐ کی مصاحبت کا شرف حاصل ہوا ہے وہ سب ایک ہی درجہ کے نہیں تھے ان میں بعض ایسے بلند مقام افراد تھے جن کی خدمات نے اسلام کے پھیلانے میں انتہائی مؤثر کردار ادا کیا ہے لیکن بعض ایسے بھی تھے جو ابتداء ہی سے منافق، دل کے مریض اور گمراہ تھے![1]اسی بیان کے ساتھ صحابۂ پیغمبرؐ کے بارے میں شیعوں کا نظریہ (جو درحقیقت قرآن اور سنت کا نظریہ ہے) واضح ہوجاتا ہے۔

[1] اس بارے میں مزید وضاحت کے لئے سورہ منافقون ملاحظہ کریں.

اٹھارہواں سوال

متعہ کیاہے اور شیعہ اسے کیوں حلال سمجھتے ہیں؟

جواب:نکاح، مرد اور عورت کے درمیان ایک ارتباط کا نام ہے. بعض اوقات یہ ارتباط دائمی ہوتا ہے اور عقد پڑھتے وقت اس میں زمانے کی کوئی قید ذکر نہیں کی جاتی لیکن بسا اوقات یہی ارتباط ایک معین مدت کے لئے انجام پاتا ہے یہ دونوں ہی عقد شرعی نکاح کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے درمیان صرف ''دائمی'' اور ''موقت'' کا فرق ہوتا ہے لیکن یہ دونوں باقی خصوصیات میں مشترک ہیں اب ہم یہاں نکاح ''متعہ'' کی ان شرائط کا ذکر کریں گے جو نکاح ''دائم'' کی طرح معتبر ہیں: ا۔مرد اور عورت کے درمیان آپس میں کوئی نسبی و سببی اور کوئی شرعی مانع نہ ہو ورنہ ان کا عقد باطل ہے.

۲۔ طرفین کی رضامندی سے معین کئے جانے والے مہر کا تذکرہ عقد میں ہونا چاہئے.

۳۔نکاح کی مدت معین ہونی چاہئے.

۴۔ شرعی طریقے سے عقد پڑھا جانا چاہئے.

۵۔ان دونوں سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ شرعی طور پر ان دونوں کی شمار ہوگی اور جس طرح نکاح دائم سے پیدا ہونے والی اولاد کا نام شناختی کارڈ وغیرہ میں درج ہوتا ہے اسی طرح عقد متعہ سے پیدا ہونے والی اولاد کا نام بھی شناختی کارڈ میں شامل کیا جاتا ہے.

٦۔اس اولاد کا نان ونفقہ والد کے ذمے ہے اور یہ اولاد ماں اور باپ دونوں سے میراث پائے گی.

۷۔جس وقت عقد متعہ کی مدت ختم ہوجائے تو اگر عورت یائسہ نہ ہو تو وہ شرعی طور پر عدہ گزارے گی اور اگراثنائے عدت میں یہ معلوم ہوجائے کہ وہ حاملہ ہے تو وضع حمل سے پہلے کسی بھی قسم کا عقد نہیں کرسکتی. اسی طرح نکاح دائم کے باقی احکام بھی متعہ میں جاری ہوں گے ان دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ چونکہ عقد متعہ چند ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے حلال کیا گیا ہے لہذا اس

عورت کا نان ونفقہ مرد کے ذمے نہیں ہے اور اگر عقد متعہ پڑھتے وقت عورت کی طرف سے میراث لینے کی شرط نہ لگائی جائی تو یہ عورت شوہر کی میراث نہیں پائے گی واضح ہے کہ ان دو فرقوں سے نکاح کی حقیقت میں کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہم سب اس بات کے معتقد ہیں کہ اسلام ایک دائمی شریعت اور آخری شریعت ہے لہذا اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ انسانوں کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اب یہاں پر اس بات کی طرف توجہ ضروری ہے کہ ایک ایسا جوان شخص جو کہ تعلیم حاصل کرنے کیلئے کسی دوسرے شہر یا ملک میں زندگی بسر کررہا ہو اور محدود وسائل کی وجہ سے دائمی عقد نہ کرسکتا ہو اسکے سامنے صرف تین راستے ہیں اور ان میں سے وہ کسی ایک کا انتخاب کرے گا۔

الف:کنوارہ ہی رہے.ب:گناہ اور آلودگی کی دلدل میں دھنس جائے.ج:گذشتہ شرائط کے ساتھ ایک ایسی عورت کے ساتھ ایک محدود اور معین مدت کے لئے شادی کرلے جس سے شرعا عقد جائز ہو. پہلی صورت کے بارے میں یہ کہنا چاہئے اس میں اکثر افراد شکست کھاجاتے ہیں اگرچہ بعض ایسے انگشت شمار اشخاص ضرور مل جائیں گے جو اپنی خواہشات کو دبا کر صبر کا دامن تھام لیتے ہیں لیکن اس روش پر عمل پیرا ہونا سب کے بس کی بات نہیں ہے. دوسرے راستے کو اختیار کرنے والوں کا انجام تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا اور اسلام کی نگاہ میں بھی یہ ایک حرام عمل ہے۔

اس فعل کو فطری تقاضے کا نام دے کر صحیح قرار دینا ایک غلط فکر ہے .اب صرف تیسرا راستہ بچتا ہے جسے اسلام نے پیش کیا ہے اور یہی مناسب اور صحیح بھی ہے پیغمبر خداؐ کے زمانے میں بھی اس پر عمل ہوتا رہا ہے اس مسئلے میں اختلاف آنحضرتؐ کے بعد پیدا ہوا ہے. یہاں پر اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ وہ لوگ جو عقد متعہ سے خوف وہراس رکھتے ہیں انہیں اس بات کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے کہ تمام اسلامی مجتہدین اور محققین نے اس متعہ کو معنوی اعتبار سے نکاح دائم میں بھی اس طرح میں قبول کیا ہے کہ جب مرد اور عورت آپس میں عقد دائم تو کریں لیکن ان کی نیت یہ ہو کہ ایک سال کے بعد یا اس سے کمتر یا بیشتر مدت میں ایک دوسرے سے جدا ہوجائیں گے تو وہ طلاق کے ذریعہ جدا ہو سکتے ہیں واضح ہے کہ اس قسم کی شادی ظاہری اعتبار سے تو دائمی ہے لیکن

حقیقت میں معین وقت کے لئے ہے اور اس قسم کے دائمی نکاح اور عقد متعہ کے درمیان صرف یہ فرق ہے کہ عقد متعہ ظاہری اور باطنی ہر دو اعتبار سے معین وقت کے لئے ہوتا ہے جبکہ اس قسم کا دائمی نکاح ظاہری طور پر تو ہمیشہ کے لئے ہے لیکن باطنی طور پر ایک محدود وقت کے لئے انجام پایا ہے.پھروہ لوگ جو اس قسم کے دائمی نکاح کو جائز سمجھتے ہیں جیسا کہ اس کو تمام مسلمان فقہاء جائز قرار دیتے ہیں تو وہ عقد متعہ کو حلال سمجھنے میں کیوں خوف وہراس محسوس کرتے ہیں.یہاں تک ہم نے عقد متعہ کی حقیقت سے آشنائی حاصل کی اب ہم دلیلوں کی روشنی میں اس کے جواز کو ثابت کریں گے اس سلسلے میں ہم دو مرحلوں میں بحث کریں گے:۱۔صدر اسلام میں عقد متعہ کا شرعا جائز ہونا.

۲۔رسول خداؐ کے زمانے میں اس حکم شرعی کا منسوخ نہ ہونا.عقد متعہ کا جواز اس آیۂ شریفہ سے ثابت ہوتا ہے: (فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً[1]) پس جب بھی تم ان عورتوں سے متعہ کرو تو انکی اجرت انہیں بطور فریضہ دے دو.اس آیہ شریفہ کے الفاظ اچھی طرح اس بات کے گواہ ہیں کہ یہ آیۂ کریمہ نکاح موقت کے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ: اول :اس آیت میں استمتاع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے ظاہری معنی نکاح موقت ہیں.اور اگر اس سے مراد دائمی نکاح ہوتا تو اس کیلئے قرینہ لایا جاتا.

دوم:اس آیت میں کلمہ ''اجورھن'' (ان کی اجرت) ہے اور یہ اس بات کا گواہ ہے کہ اس آیت سے مراد عقد متعہ ہے کیونکہ نکاح دائم میں لفظ ''مہر''اور لفظ ''صداق''استعمال کئے جاتے ہیں.

سوم: شیعہ اور سنی مفسرین اس بات کے معتقد ہیں کہ یہ آیۂ شریفہ عقد متعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جلال الدین سیوطی اپنی تفسیر درالمنثور میں ابن جریر اور سدی سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت عقد متعہ کے بارے میں ہے[2] اسی طرح ابوجعفر محمد بن جریر طبری اپنی تفسیر میں سدی اور مجاہد اور ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت نکاح موقت کے بارے میں ہے[3]

---

[1] سورہ نساء آیت:۲۴.
[2] تفسیر درالمنثور جلد۲ ص۱۴۰ سورہ نساء کی ۲۴ویں آیت کے ذیل میں.
[3] جامع البیان فی تفسیر القرآن جزء ۵ ص۹.

چہارم:صاحبان صحاح و مسانیداور احادیث کی کتابوں کے مولفین نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے بعنوان مثال مسلم بن حجاج نے اپنی کتاب صحیح میں جابر بن عبداللہ اور سلمہ بن اکوع سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا :خرج علینا منادي رسول اللہ [ص]فقال: إن رسول اللہ قد أذن لکم أن تستمتعوا یعني متعۃ النساء[1]پیغمبر اکرمؐ کے منادی نے ہمارے پاس آکر کہا کہ رسول خدا [ص]نے تم لوگوں کو استمتاع کی اجازت دی ہے یعنی عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی ہے.عقد متعہ سے متعلق صحاح اور مسانید میں جو روایات آئی ہیں ان سب کو اس کتاب میں بیان نہیں کیا جاسکتا البتہ ان سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ عالم اسلام کے تمام علماء اور مفسرین نے آغاز اسلام میں اور پیغمبر اکرم [ص]کے زمانے میں عقد متعہ کے جائز ہونے کو تسلیم کیا ہے[2]:اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس آیت کا حکم منسوخ ہوا ہے یا نہیں؟شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جو پیغمبر خداؐ کے زمانے میں متعہ کے شرعا جائز ہونے کے بارے میں تردید کرے بحث اس بارے میں ہے کہ یہ حکم آنحضرتؐ کے زمانے میں باقی تھا یا منسوخ ہوگیا تھا؟

تاریخ اسلام اور روایات کے مطابق خلیفہ دوم کے زمانے تک مسلمان اس حکم الہی پر عمل کرتے تھے اور سب سے پہلے خلیفہ دوم نے چند مصلحتوں کی بنا پر اس حکم پر عمل کرنے سے مسلمانوں کو روکا تھا . مسلم بن حجاج اپنی کتاب صحیح میں نقل کرتے ہیں کہ جب ابن عباس اور ابن زبیر کے درمیان متعۃ النساء اور متعہ حج کے سلسلے میں اختلاف ہوگیا تو جابر ابن عبداللہ نے کہا ‘‘: فعلنا ھما مع رسول اللہ [ص]ثم نھانا عنھما عمر فلم نعد لھما[3]’’.......سنن بیہقی جلد ۷ ص ۲۰۶

تفسیر طبری جلد ۵ ص ۹

نہایہ ابن اثیر جلد ۳ ص ۲۴۹

تفسیر رازی جلد ۳ ص ۲۰۱

تاریخ ابن خلکان جلد ۱ ص ۳۵۹

---

[1] صحیح مسلم جز ۴ ص ۱۳۰ طبع مصر

[2] نمونے کے طور پر ہم ان منابع میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں: صحیح بخاری باب تمتع۲ مسند احمد جلد۴ ص۴۳۶ اور جلد ۳ ص ۳۵۶الموطا مالک جلد۲ ص ۳۰ ......

[3] سنن بیہقی جلد۷ ص۲۰۶ اور صحیح مسلم جلد۱ ص۳۹۵

احکام القرآن جصاص جلد ۲ ص ۱۷

محاضرات راغب جلد ۲ ص ۹۴

الجامع الکبیر سیوطی جلد ۸ ص ۲۹۳

فتح الباری ابن حجر جلد ۹ ص ۱۴۱

ہم رسول خدا [ص]کے ہمراہ متعۃ النساء اور متعہ حج کو انجام دیتے تھے اور پھر عمر نے ہمیں ان دونوں کاموں سے روک دیا اس کے بعد سے ہم نے ان دونوں کو انجام نہیں دیا ہے .جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر میں عبد الرزاق اور ابو داؤد اور ابن جریر سے اور ان سب نے ''حکم'' سے روایت کی ہے کہ جب حکم سے آیۂ متعہ کے بارے میں سوال کیا گیا کہ کیا یہ آیت منسوخ ہوئی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا نہیں منسوخ نہیں ہوئی ہے اور حضرت علی ـ نے فرمایا ہے '':لولا أن عمر نهىٰ عن المتعة ما زنىٰ إلاّ شقي[1]'' اگر عمر نے متعہ سے منع نہ کیا ہوتا تو سوائے بد بخت کے کوئی زنا نہ کرتا نیز علی بن محمد قوشچی کہتے ہیں کہ عمر بن خطاب نے منبر پر بیٹھ کر کہا : ''أيّها الناس ثلاث كن على عهد رسول اللّٰه وأنا أنهىٰ عنهن و أحرمهن و أعاقب عليهن وهي متعة النساء و متعة الحج و حيّ علىٰ خير العمل[2]'' اے لوگو! تین چیزیں رسول خداؐ کے زمانہ میں تھیں لیکن میں ان سے منع کرتا ہوں اور انہیں حرام قرار دیتا ہوں اور جو کوئی بھی انہیں انجام دے گا، میں اسے سزا دوں گا وہ تین چیزیں یہ ہیں : متعۃ النساء اور متعۃ الحج اور حی علی خیر العمل. عقد متعہ کے جائز ہونے کے بارے میں اس قدر روایات ہیں کہ ان کو ذکر کرنا اس کتاب کی گنجائش سے باہر ہے.زیادہ معلومات کے لئے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ فرمائیں[3] اب یہ مان لینا چاہیے کہ متعہ نکاح ہی کی ایک قسم ہے کیونکہ نکاح کی دو قسمیں ہیں:دائمی اور موقت اور وہ عورت جس کے ساتھ نکاح موقت کیا جائے وہ اس مرد کی زوجہ شمار ہوتی ہے اور وہ مرد بھی اس عورت کا شوہر کہلاتا

---

[1] تفسیر درالمنثور جلد۲ ص۱۴۰ سورہ نساء کی چوبیسویں آیت کی تفسیر کے ذیل میں.

[2] شرح تجرید قوشچی بحث امامت ص۴۸۴.

[3] مسند احمد جلد۳ ص۳۵۶البیان والتبیین جاحظ جلد۲صفحہ ۲۲۳احکام القرآن جصاص جلد۱ ص ۳۴۲تفسیر قرطبی جلد۲ ص ۳۷۰المبسوط سرخسی حنفی کتاب الحج باب القرآن زادالمعاد ابن قیم جلد۱ ص۴۴۴کنزالعمال جلد۸ ص۲۹۳مسند ابی داؤد طیالسی ۲۴۷تاریخ طبری جلد۵ ص۳۲المستبین طبری تفسیر رازی جلد۳ص۲۰۰سے ۲۰۲ تکتفسیر ابوحیان جلد۳ ص ۲۱۸

ہے اس اعتبار سے فطری طور پر اس قسم کی شادی بھی نکاح سے متعلق آیتوں کے ذیل میں آئے گی مثال کے طور پر قرآن مجید کی یہ آیت ملاحظہ ہو: (وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ[1]) اور مومنین اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنیوالے میں علاوہ اپنی بیویوں اور اپنی ملکیت کی کنیزوں کے.اب تمام گزشتہ شرائط کے ساتھ جس عورت سے متعہ کیا جائے وہ '' إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ '' (سوائے اپنی بیویوں کے)کا ایک مصداق قرار پائے گی یعنی یہ عورت اس مرد کی زوجہ کہلائے گی اور لفظ '' أَزْوَاجِهِمْ ''اس کو بھی اپنے اندر شامل کرے گا.سورہ مومنون کی یہ آیت جنسی عمل کو فقط دو قسم کی عورتوں یعنی بیویوں اور کنیزوں کے ساتھ جائز قرار دیتی ہے اور وہ عورت جس سے متعہ کیا گیا ہو وہ پہلی قسم کی عورتوں (یعنی اپنی بیویوں) میں شامل ہے.

یہاں پر بعض لوگوں کا یہ کلام تعجب خیز ہے کہ سورہ مومنون کی یہ آیت سورہ نساء کی چوبیسویں آیت کیلئے ناسخ ہے جب کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ناسخ آیت کو منسوخ ہونے والی آیت کے بعد نازل ہونا چاہیے اور یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے سورہ مومنون جسکی آیت کو ناسخ تصور کیا جارہاہے وہ مکی ہے (یعنی یہ سورہ آنحضرتؐ کی ہجرت سے قبل مکہ معظمہ میں نازل ہوا ہے) اور سورہ نساء جس میں آیۂ متعہ ہے مدنی ہے (یعنی یہ سورہ مدینۂ منورہ میں آنحضرتؐ کی ہجرت کے بعد نازل ہوا ہے) اب سوال یہ ہے کہ مکی سورہ میں آنے والی آیت مدنی سورہ میں آنے والی آیت کیلئے کیسے ناسخ بن سکتی ہے؟ اسی طرح رسول خداؐ کے زمانے میں آیہ متعہ کے منسوخ نہ ہونے کی ایک اور واضح دلیل وہ کثیر روایات ہیں جن کے مطابق یہ آیت آنحضرتؐ کے زمانے میں منسوخ نہیں ہوئی تھی ایسی روایتوں میں سے ایک روایت تو وہی ہے جسے جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر درالمنثور میں ذکر کیا ہے اور جس کی وضاحت گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے[2] آخر میں ہم اس نکتے کا ذکر کردیں کہ وہ ائمہ معصومین[ع]جو حدیث ثقلین کے مطابق امت کے ہادی اور قرآن کے ہم پلہ ہیں انہوں نے عقد متعہ کے شرعاجائز ہونے اور اس کے منسوخ نہ کئے جانے کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے[3].ساتھ ہی ساتھ اسلام چونکہ ہرزمانے میں انسانوں کی مشکلات کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لہذا اس نے بھی چند ذکر شدہ شرائط کی رعایت کے

---

[1] سورہ مومنون آیت :۵اور ۶

[2] تفسیر درالمنثور جلد۲ ص ۱۴۰ اور ص ۱۴۱ سورہ نساء کی چوبیسویں آیت کی تفسیر کے ذیل میں.

[3] وسائل الشیعہ جلد۱۴ کتاب النکاح ابواب متعہ باب اول ص ۴۳۶.

ساتھ اس قسم کے نکاح کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ آج کی اس گمراہ کن دنیا میں جوانوں کو تباہی کے دلدل سے نجات دینے کے لئے ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے متعہ۔

انیسواں سوال

شیعہ خاک پر کیوں سجدہ کرتے ہیں؟

جواب:بعض لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ خاک یا شہیدوں کی تربت پر سجدہ کرنا ان کی عبادت کرنے کے برابر ہے اوریہ ایک قسم کا شرک ہے . اس سوال کے جواب میں اس بات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ ان دو جملوں ''السجود للہ''و ''السجود علیٰ الأرض'' میں بڑا فرق ہےاور اس سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوال کرنے والا ان دو جملوں کے درمیان موجود فرق کو نہیں سمجھ پایا ہے .

السجود للہ کے معنی یہ ہیں کہ سجدہ خدا کے لئے ہوتا ہے اور السجود علیٰ الأرضیعنی سجدہ زمین پر ہوتا ہے.بہ الفاظ دیگر ہم زمین پر خدائے عظیم کا سجدہ بجا لاتے ہیں اصولی طور پر دنیا کے سارے مسلمان کسی نہ کسی چیز کےاوپر سجدہ کرتے ہیں جبکہ وہ خدا کا سجدہ کرتے ہیں مسجد الحرام میں بھی لوگ پتھروں پر سجدہ کرتے ہیں جبکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خدا کا سجدہ کررہے ہیں.اس بیان کے ساتھ یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ خاک یا پتوں یا کسی اور چیز پر سجدہ کرنا ان چیزوں کی عبادت نہیں ہے.بلکہ اس کے ذریعہ خدائے عظیم کے سامنے خود کو خاک سمجھتے ہوئے اس کے لئے سجدہ کرنا مقصود ہوتا ہےاور اسی طرح یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ خاک شفا پر سجدہ کرنا خاک شفا کو سجدہ کرنا نہیں ہے.قرآن مجید فرماتا ہے:(وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ[1]) اللہ ہی کو زمین و آسمان میں رہنے والے سب سجدہ کرتے ہیں.نیز پیغمبرؐ اسلام فرماتے ہیں '': جُعِلَتْ لي الأرض مسجدا و طهورا[2]''زمین میرے لئے جائے سجدہ اور پاک کرنے والی قرار دی گئی ہے.لہذا ''خدا کے لئے سجدہ '' اور ''زمین یا خاک شفا پر سجدہ'' کے درمیان آپس میں پوری طرح سازگاری ہے کیونکہ خاک اور پتوں پر سجدہ کرنا خدائے عظیم کے سامنے انتہائی درجہ کے خضوع کی علامت ہے . اس بارے میں شیعوں کے نظریئے کی وضاحت کے لئے بہتر یہ ہے کہ ہم امام صادق ـ کے اس گہر بار ارشاد کو پیش کریں '':عن ھشام ابن الحکم

---

[1] سورہ رعد آیت: ١٥

[2] صحیح بخاری کتاب الصلوة ص٩١

قال قلت لأبي عبداللہ ۔ اخبرني عما یجوز السجود علیہ و عما لایجوز علیہ؟ قال : السجود لایجوز إلاّعلی الأرض أو ما أنبتت إلاّرض الا ماأکل أو لبس فقلت لہ: جعلت فداک ما العلّۃ في ذلک؟ قال: لأن السجود ھوا لخضوع للہ عزّوجلّ فلا ینبغي أن یکون علیٰ ما یؤکل و یلبس لأن أبناء الدنیا عبید ما یأکلون و یلبسون والساجد في سجودہ في عبادۃ اللہ عزّوجلّ فلا ینبغي أن یضع جبھتہ في سجودہ علیٰ معبود أبناء الدنیا الذین اغتروا بغرورھا والسجود علیٰ الأرض أفضل لأنہ أبلغ في التواضع والخضوع للہ عزّوجلّ"[1]ہشام بن حکم کہتے ہیں کہ میں نے امام صادق ۔ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ رہنمائی فرمائیں کہ کن چیزوں پر سجدہ کرنا صحیح ہے اور کن چیزوں پر صحیح نہیں ہے؟ امام ۔ نے فرمایا سجدہ صرف زمین اور اس سے اگنے والی اشیاء پر ہوسکتا ہے لیکن کھانے اور پہننے والی اشیاء پر سجدہ نہیں کیا جاسکتا میں نے عرض کی : میں آپ پر قربان ہوجاؤں اس کا کیا سبب ہے؟ امام ۔نے فرمایا : سجدہ خداوند عزوجل کے لئے خضوع کا نام ہے پس یہ صحیح نہیں ہے کہ کھانے اور پہننے والی چیزوں پر سجدہ کیا جائے کیونکہ دنیا پرست افراد خوراک اور لباس کے بندے ہیں جبکہ انسان سجدے کی حالت میں اللہ عزوجل کی عبادت میں مشغول ہوتا ہےپس یہ مناسب نہیں ہے کہ اپنی پیشانی اس چیز پر رکھے جس کو دنیا پرست اپنا معبود سمجھتے ہیں اور وہ دنیا کے دھوکہ میں آگئے ہیں اور زمین پر سجدہ کرنا افضل ہے کیونکہ اس سے خدا کی بارگاہ میں زیادہ خضوع کا اظہار ہوتا ہے.

امام کا یہ کلام اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ خاک پر سجدہ اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ یہ کام خدا کی بارگاہ میں تواضع کو ظاہر کرنے کا سب سے اچھا طریقہ ہے.یہاں پرایک اور سوال بھی سامنے آتا ہے کہ شیعہ صرف خاک اور بعض پتوں ہی پر کیوں سجدہ کرتے ہیں اور باقی چیزوں پر سجدہ کیوں نہیں کرتے؟اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس طرح یہ ضروری ہے کہ ہر عبادت کا حکم شریعت کی طرف سے ہم تک پہنچے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے تمام شرائط ، اجزاء ، اور اس کا طریقہ بھی شریعت کو بیان کرنے والی شخصیت یعنی پیغمبر اکرم [ص]کے اقوال اور کردار کے ذریعے ہم تک پہنچے کیونکہ قرآن کے حکم کے مطابق تمام مسلمانوں کے لئے اسوہ

[1] بحارالانوار جلد ۸۵ ص۱۴۷ "علل الشرائع" سے نقل کرتے ہوئے.

اور نمونہ عمل فقط پیغمبر گرامیؐ کی ذات ہے. اب ہم چند ایسی احادیث ذکر کرتے ہیں جو اس بارے میں پیغمبر اسلامؐ کی سیرت کو بیان کرتی ہیں یہ حدیثیں اس بات کو بیان کرتی ہیں کہ آنحضرتؐ خاک پر اور زمین سے اگنے والی بعض چیزوں جیسے چٹائی وغیرہ پر سجدہ فرماتے تھے اور آج شیعہ بھی اسی چیز کا عقیدہ رکھتے ہیں بہت سے مسلمان محدثین نے اپنی صحاح ومسانید میں آنحضرتؐ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے زمین کو اپنے لئے سجدہ کے عنوان سے پہنچوایا تھا آنحضرتؐ فرماتے ہیں ''؛جعلت لي الأرض مسجدا و طهورا[1] ''زمین میرے لئے جائے سجدہ اور پاک کرنے والی قرار دی گئی ہے.ا)اس حدیث میں لفظ ''جعلت '' قانون گزاری کے معنی میں ہے اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ مسئلہ دین اسلام کی پیروی کرنے والوں کے لئے ایک حکم الہی ہے اس حدیث سے خاک،پتھر اور ہر اس چیز پر سجدے کا جائز ہونا ثابت ہوتا ہے کہ جس کو زمین کہا جا سکے.

۲۔بعض دوسری روایات اس نکتے پر دلالت کرتی ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ سجدہ کرتے وقت اپنی پیشانیوں کو خاک پر رکھا کریں جیسا کہ زوجہ پیغمبرؐ ام سلمہ آنحضرتؐ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا '':ترب وجهك لله[2] ''اللہ کے لئے اپنے چہرے کو خاک پر رکھو.اس حدیث میں ''ترب '' کے لفظ سے دو نکتے سمجھ میں آتے ہیں ایک یہ ہے کہ انسان کو سجدہ کرتے وقت اپنی پیشانی کو خاک پر رکھنا چاہیے دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ''ترب '' صیغہ امر ہے لہذا خاک پر سجدہ کرنا واجب ہے.

۳۔خود آنحضرتؐ کا عمل بھی خاک پر سجدے کے صحیح ہونے کا بہترین گواہ ہے وائل بن حجر کہتے ہیں '':رأيت النبي [ص]إذا سجد وضع جبهته و أنفه علىٰ الأرض[3] ''میں نے پیغمبر [ص]کو دیکھا ہے کہ جب آپ سجدہ کرتے تھے تو اپنی پیشانی اور ناک کو زمین پر رکھتے تھے.انس بن مالک اور ابن عباس اور آپؐ کی ازواج جیسے عائشہ اور ام سلمہ اور بہت سے محدثین نے اس طرح روایت کی ہے '':كان رسول الله [ص]يصلي علىٰ الخمرة[4] ''رسول خدا [ص]چٹائی پر نماز پڑھتے تھے (ایسی چٹائی جوکہ کھجور کی پتیوں سے تیار کی جاتی

---

[1] سنن بیہقی جلد۱ ص ۲۱۲(باب التیمم بالصعید الطیب)صحیح بخاری جلد۱ کتاب الصلوۃ ص۹۱ اقتضاءالصراط المستقیم (ابن تیمیہ) ص ۳۳۲.

[2] کنزالعمال جلد۷ ص ۴۶۵ حدیث نمبر ۱۹۸۰۹ کتاب الصلوۃ السجود و مایتعلق بہ.

[3] احکام القرآن (جصاص حنفی جلد۳ ص۲۰۹ باب السجود علی الوجہ)

[4] سنن بیہقی جلد۲ ص۴۲۱ کتاب الصلوۃ علی الخمرہ.

تھی) پیغمبر اکرمؐ کے صحابی ابو سعید کہتے ہیں کہ ''دخلت علیٰ رسول اللہ [ص] وھو یصلي علیٰ حصیر[1]''میں رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ چٹائی پر نماز پڑھ رہے تھے. یہ بات شیعوں کے نظرئیے کے صحیح ہونے کی گواہی دیتی ہے کیونکہ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ زمین سے اگنے والی ان اشیاء پر سجدہ صحیح ہے جو نہ تو کھائی جاتی ہوں اور نہ ہی پہنی جاتی ہوں.

۴۔پیغمبر اسلامؐ کے اصحاب اور تابعین کی سیرت اور ان کے اقوال بھی اس بارے میں آنحضرت کی سنت کو بیان کرتے ہیں :جابر بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں '': کنت أصلي الظھر مع رسول اللہ [ص] فأخذ قبضۃ من الحصاء لتبرد في کفي أضعھا لجبھتي أسجد علیھا لشدۃ الحرّ[2]''جب میں رسول اللہ [ص] کے ساتھ نماز ظہر پڑھتا تھا تو اپنی مٹھی میں سنگ ریزے اٹھا لیتا تھا تاکہ وہ میرے ہاتھ میں ٹھنڈے ہو جائیں اور انہیں سجدہ کے وقت اپنی پیشانی کے نیچے رکھ سکوں کیونکہ گرمی بہت شدید تھی,اور پھر خود راوی نے اس بات کا اضافہ کیا ہے کہ اگر اپنے کپڑوں پر سجدہ کرنا جائز ہوتا تو یہ سنگریزوں کے اٹھانے اور انہیں سنبھالنے سے آسان تھا.

ابن سعد (وفات سنہ ۲۰۹ھ) اپنی کتاب ''الطبقات الکبریٰ'' میں یوں لکھتے ہیں '':کان مسروق إذا خرج یخرج بلبنۃ یسجد علیھا في السفینۃ[3]''مسروق ابن اجدع جس وقت سفر کے لئے نکلتے تھے تو اپنے ساتھ ایک کچی اینٹ رکھ لیتے تھے تاکہ کشتی میں اس پر سجدہ کر سکیں. مسروق بن اجدع پیغمبرؐ کے تابعین اور ابن مسعود کے اصحاب میں سے تھے,کتاب ''الطبقات الکبریٰ'' کے مؤلف ان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں '':وہ پیغمبر اکرمؐ کے بعد اہل کوفہ میں سے طبقہ اول کے لوگوں میں سے تھے اور انہوں نے ابوبکر، عمر، عثمان، علی,اور عبداللہ بن مسعود سے روایتیں نقل کی ہیں''.اس کلام سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مٹی کی سجدہ گاہ کا ہمراہ رکھنا ہرگز شرک یا بدعت نہیں ہے کیونکہ صحابہ کرام بھی ایسا کرتے تھے[4] نافع کہتے ہیں '': ان ابن عمر کان اذا سجد و علیہ العمامۃ یرفعھا حتیٰ یضع جبھتہ بالأرض[5]''عبد اللہ بن عمر سجدہ کرتے وقت اپنے عمامے کو اوپر کرلیا کرتے تھے تاکہ اپنی پیشانی کو زمین پر رکھ سکیں.رزین

---

[1] گذشتہ حوالہ
[2] سنن بیہقی جلد۱ ص۴۳۹کتاب الصلوۃ باب ماروی فی التعجیل بھا فی شدۃ الحر.
[3]،الطبقات الکبری ''جلد ۶ ص۷۹ طبع بیروت مسروق بن اجدع کے حالات کو بیان کرتے ہوئے
[4] اس سلسلے میں مزید شواہد کے لئے علامہ امینیؒ کی کتاب ''سیرتنا'' کی طرف مراجعہ فرمائیں.
[5] سنن بیہقی جلد۲ ص۱۰۵(مطبوعہ حیدرآباد دکن) کتاب الصلوۃ باب الکشف عن السجدۃ فی السجود

کہتے ہیں'':کتب إليّ عليّ بن عبدالله بن عباس ۲۳۹ أن أبعث إليّ بلوح من أحجار المروة أسجد عليها[1]''علی بن عبداللہ بن عباس ۲۳۹نے مجھے لکھا کہ مروہ پہاڑ کے ایک پتھر کی تختی میرے پاس بھیج دو تاکہ میں اس پر سجدہ کر سکوں.

۵۔دوسری طرف سے مسلمان محدثین نے کچھ روایتیں نقل کی ہیں جن کے مطابق پیغمبر اسلام [ص]نے ایسے افراد کو ٹوکا ہے جو سجدہ کرتے وقت اپنی پیشانی اور زمین کے درمیان عمامے کے کپڑے کو حائل کرلیا کرتے تھے. صالح سبائی کہتے ہیں '': إن رسول الله [ص]رأى رجلاً يسجد علىٰ جنبه و قد اعتم علىٰ جبهته فحسر رسول الله [ص]علىٰ جبهته[2]''رسول خدا [ص]نے اپنے پاس ایک ایسے شخص کو سجدہ کرتے دیکھا جس نے اپنی پیشانی پر عمامہ باندھ رکھا تھا تو آنحضرتؐ نے اس کے عمامے کو ہٹا دیا. عیاض بن عبداللہ قرشی کہتے ہیں'':رأى رسول الله [ص]رجلاً يسجد علىٰ كور عمامته فأومأ بيده ارفع عمامتك وأومأ الىٰ جبهته[3]''رسول خدا [ص]نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنے عمامے کے ایک گوشے پر سجدہ کررہا تھا تو آپ نے اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر پیشانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اپنے عمامے کو اوپر اٹھاؤ.ان روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسول خداؐ کے زمانے میں زمین پر سجدہ کرنا ایک لازمی امر تھا اور جب بھی کوئی شخص عمامے پر سجدہ کرتا تو آنحضرتؐ اسے اس کام سے روکتے تھے.

۶۔شیعوں کے ائمہ اطہار [ع]جوکہ حدیث ثقلین کے مطابق، قرآن مجید سے کبھی جدا نہ ہوں گے اور دوسری طرف وہ پیغمبر اکرمؐ کے اہل بیت ہیں انہوں نے زمین پر سجدہ کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے امام صادق ۔ فرماتے ہیں'':السجود علىٰ الأرض فريضة و علىٰ الخمرة سنة[4]''زمین پر سجدہ کرنا حکم الہی ہے اور چٹائی پر سجدہ سنت پیغمبر [ص]ہے.اور ایک مقام پر فرماتے ہیں'': السجود لايجوز إلا علىٰ الأرض أو علىٰ ما أنبتت الأرض إلا ما أكل أو لبس[5]''سجدہ کرنا صحیح نہیں ہے سوائے زمین یا اس سے اگنے والی اشیاء پر لیکن کھائی اور پہننے والی اشیاء پر سجدہ نہیں ہوسکتا.

[1] ازرقی ،اخبار مکہ جلد ۳ ص۱۵۱
[2] سنن بیہقی جلد۲ ص ۱۰۵
[3] گذشتہ حوالہ.
[4] وسائل الشیعہ جلد۳ ص۵۹۳ کتاب الصلوة ابواب ما یسجد علیہ ،حدیث نمبر ۷.
[5] وسائل الشیعہ جلد۳ ص۵۹۱ کتاب الصلوة ابواب ما یسجد علیہ ،حدیث نمبر ۱.

نتیجہ: گزشتہ دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نہ صرف اہل بیت[ع]کی روایات بلکہ رسول خداؐ کی سنت اور آنحضرتؐ کے اصحاب اور تابعین کی سیرت اس بات کی گواہ ہیں کہ سجدہ صرف زمین یا اس سے اگنے والی اشیاء (سوائے کھانے اور پہنے جانے والی اشیاء کے) پر ہی کیا جاسکتا ہے اس کے علاوہ بقیہ دوسری چیزوں پر سجدے کے جائز ہونے کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے لہذا اس احتیاط پر عمل کرتے ہوئے نجات اور کامیابی کی راہ صرف یہ ہے کہ ان چیزوں پر سجدہ کیا جائے جن پر سب کا اتفاق ہے آخر میں ہم اس نکتے کی یاد آوری ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ بحث صرف ایک فقہی مسئلہ ہے اور اس قسم کے جزئی مسائل کے بارے میں مسلمان فقہاء کے درمیان بہت اختلافات ہیں لیکن اس قسم کے اختلافات کو کسی قسم کی پریشانی کا باعث نہیں بننا چاہیے کیونکہ اس قسم کے فقہی اختلافات اہل سنت کے چار فرقوں کے درمیان فراوان ہیں مثال کے طورپر مالکی کہتے ہیں کہ ناک کو سجدہ گاہ پر رکھنا مستحب ہے جب کہ حنبلی کہتے ہیں کہ یہ عمل واجب ہے اور اسے چھوڑنے کی صورت میں سجدہ باطل ہوجائے گا[1]۔

[1] الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد۱ ص ۱۶۱ طبع مصر کتاب الصلوة ، بحث سجود.

بیسواں سوال

شیعہ حضرات زیارت کرتے وقت حرم کے دروازوںاور دیواروں کو کیوں چومتے ہیں اور انہیں باعث برکت کیوں سمجھتے ہیں؟

جواب:اولیائے الہی سے منسوب اشیاء کو اپنے لئے باعث برکت سمجھنا کوئی ایسا جدید مسئلہ نہیں ہے جو مسلمانوں کے درمیان آج پیدا ہوا ہو بلکہ اس کی بنیادیں رسول خداؐ اور ان کے صحابہ کے زمانے میں دکھائی دیتی ہیں. اس عمل کو نبی اکرمؐ اور ان کے اصحاب ہی نے انجام نہیں دیا ہے بلکہ گزشتہ انبیاء[ع] بھی ایسا ہی کرتے تھے اب ہم آپ کے سامنے اس عمل کے جائز ہونے کے سلسلے میں قرآن مجید اور سنت پیغمبرؐ سے چند دلیلیں پیش کرتے ہیں:۱۔قرآن مجید میں ہم پڑھتے ہیں کہ جس وقت حضرت یوسف۔ نے اپنے بھائیوں کے سامنے خود کو پہچنوایا اور ان کے گناہوں کو معاف کردیا تو یہ فرمایا: (اِذْہَبُوا بِقَمِيصِي ہٰذَا فَأَلْقُوہُ عَلَىٰ وَجْہِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا[۱])

میری یہ قمیص لے کر جاؤ اورمیرے بابا کے چہرے پر ڈال دو کہ انکی بصارت پلٹ آئے گی.

اور پھر قرآن فرماتا ہے: (فَلَمَّا أَن جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاہُ عَلَىٰ وَجْہِہِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا[۲]) اور اس کے بعد جب بشارت دینے والے نے آکر قمیص کو یعقوب کے چہرے پر ڈال دیا تو وہ دوبارہ صاحب بصارت ہوگئے. قرآن مجید کی یہ آیتیں گواہی دے رہی ہیں کہ ایک نبی (جناب یعقوب۔) نے دوسرے نبی (جناب یوسف۔) کی قمیص کو باعث برکت سمجھا تھا اور یہی نہیں بلکہ حضرت یعقوب۔ کا یہ عمل ان کی بصارت کے لوٹنے کا سبب بنا تھا. کیا یہاں پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان دو انبیاء کے اس عمل نے انہیں توحید اور عبادت خدا کے دائرے سے خارج کردیا تھا!؟

---

[۱] سورہ یوسف آیت:۹۳
[۲] سورہ یوسف آیت:۹۶

۲۔اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ رسول خداؐ خانہ کعبہ کا طواف کرتے وقت انہوں نے جواب دیا ''رایت رسول اللہ [ص] یستلمہ ویقبلہ[1]''میں نے رسول خداؐ کو دیکھا ہے کہ وہ حجر اسود کو سلام کررہے تھے اور بوسے دے رہے تھے.اگر ایک پتھر کو سلام کرنا اور بوسے دینا شرک ہوتا تو نبی اکرمؐ ہرگز اس عمل کو انجام نہ دیتے.

۳۔ صحیح، مسنداور تاریخی کتابوں میں بہت سی ایسی روایات ہیں جن کے مطابق صحابۂ کرام آنحضرتؐ سے منسوب اشیاء جیسے آپؐ کا لباس،آپ کے وضو کا پانی اور برتن وغیرہ کو باعث برکت سمجھتے تھے اگر ان روایات کا مطالعہ کیا جائے تو اس عمل کے جائز ہونے میں کسی بھی قسم کی تردید باقی نہیں رہے گی.اگرچہ اس بارے میں وارد ہونے والی روایات کی تعداد زیادہ ہے اور سب کو اس مختصر کتاب میں پیش کرنا ممکن نہیں ہے لیکن پھر بھی یہاں ہم ان میں سے بعض روایتوں کو نمونہ کے طور پر پیش کررہے ہیں: الف: بخاری نے اپنی کتاب صحیح میں آنحضرتؐ اور ان کے اصحاب کے خصوصیات کو بیان کرنے والی ایک طولانی روایت کے ضمن میں یوں نقل کیا ہے ''واذا توضأ کادوا یقتتلون علیٰ وضوءِ[2]''جس وقت پیغمبر خداؐ وضو کرتے تھے تو نزدیک ہوتا تھا کہ مسلمان آپؐ کے وضوکے پانی کو حاصل کرنے کے لئے آپس میں جنگ شروع کردیں۔

ب:ابن حجر کہتے ہیں کہ ''اِن النبي [ص]کان یؤتي بالصبیان فیبرك علیهم[3]''بے شک نبی اکرم [ص]کی خدمت میں بچوں کو لایا جاتا تھا اور آنحضرتؐ اپنے وجود کی برکت سے انہیں بھی بابرکت بنا دیتے تھے۔

ج: محمد طاہر مکی کہتے ہیں: ام ثابت سے روایت ہوئی ہے وہ کہتی ہیں: کہ رسول خداؐ میرے ہاں تشریف لائے اور آپ نے دیوار پر آویزاں ایک مشک کے دھانے سے کھڑے ہو کر پانی نوش فرمایا یہ دیکھ کر میں اپنی جگہ سے اٹھی اور میں نے اس مشک کے دھانے کو کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا اور پھر اضافہ کرتے ہوئے کہتے ہیں : اسی حدیث کو ترمذی نے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح اور حسن ہے اور کتاب ریاض الصالحین میں اس حدیث کی شرح میں کہا گیا ہے کہ ام ثابت نے مشک کے دھانے کو

---

[1] صحیح بخاری جزء۲ کتاب الحج باب تقبیل الحجر ص ۱۵۱ اور ص ۱۵۲ طبع مصر.
[2] صحیح بخاری جلد۳ باب مایجوز من الشروط في الاسلام باب الشروط في الجهاد والمصالحة ص ۱۹۵
[3] الاصابة جلد۱ خطبہ کتاب ص۷ طبع مصر

اس لئے کاٹ لیا تھا تاکہ وہ اس جگہ کو اپنے پاس محفوظ کرلیں جہاں سے پیغمبر اکرمؐ نے پانی نوش فرمایا تھا کیونکہ وہ اسے باعث برکت سمجھتی تھیں اسی طرح صحابہ کی بھی یہی کوشش رہتی تھی کہ وہ اس جگہ سے پانی پیئیں جہاں سے پیغمبر اکرمؐ نے پانی پیا ہو!.

‹‹کان رسول اللہ [ص]اِذا صلیٰ الغداۃ جاء خدم المدینۃ بآنیتھم فیھا الماء فاٗیُؤتی باناءٍ الا غمس یدہ فیھا فربما جاؤوہ في الغداۃ الباردۃ فیغمس یدہ فیھا[2]›› رسول خداؐ جب نماز صبح سے فارغ ہوجاتے تو مدینہ کے خادم پانی کے برتن لئے آنحضرتؐ کی خدمت میں آتے تھے اور آپؐ ان سب برتنوں میں اپنا ہاتھ ڈبو دیتے تھے بعض اوقات تو وہ لوگ ٹھنڈک والی صبح میں آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچ جاتے تھے لیکن پھر بھی آنحضرتؐ ان کے برتنوں میں ہاتھ ڈبو دیتے تھے[3]. گذشتہ دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اولیائے الٰہی سے منسوب اشیاء کو باعث برکت قرار دینا ایک جائز عمل ہے اور وہ لوگ جو شیعوں پر اس عمل کی وجہ سے تہمت لگاتے ہیں وہ توحید اور شرک کے معنی کو اچھی طرح سے سمجھ نہیں پائے ہیں کیونکہ شرک کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی عبادت کے ساتھ کسی دوسرے کو بھی خدا سمجھا جائے یا یہ عقیدہ ہو کہ خدائی امور اس کے سپرد کردئیے گئے ہیں اور وہ اپنے وجود اور جبکہ شیعہ اولیائے الٰہی اور ان سے متعلق اشیاء کو خدا کی مخلوق اور اس کا محتاج سمجھتے ہیں اور وہ اپنے اماموں اور دین کے پرچمداروں کے احترام اور ان سے سچی محبت کے اظہار کے لئے ان بزرگوں کو باعث برکت قرار دے کر ان سے فیض حاصل کرتے ہیں ۔

شیعوں کا پیغمبر اسلامؐ اور ان کے اہل بیت [ع] کے حرم میں جاکر ان کی ضریح مقدس کو بوسہ دینا یا حرم کے در و دیوار کو مس کرنا صرف اس وجہ سے ہے کہ ان کے دل پیغمبر خداؐ اور ان کی عترتؑ کے عشق سے سرشار ہیں اور یہ عشق ہر انسان کی فطرت میں پایا جاتا ہے اور یہ ایک انسانی محبت کا جذبہ ہے جو ہر محبتی انسان کے اندر ظاہر ہوتا ہے : اس بارے میں ایک شاعر کہتا ہے:

أمر علیٰ الدیار دیار سلمیٰ اُقبل ذاالجدار و ذا الجدار اوما حُب الدیار شغفن قلبي ولکن حُب مَن سکن الدیارا میں جب سلمیٰ کے دیار سے

---

[1] تبرک الصحابہ (محمد طاہر مکی) فصل اول ص٢٩ترجمہ انصاری.

[2] صحیح مسلم جزء ٧ کتاب الفضائل باب قرب النبیؐ من الناس و تبرکھم بہ، ص٧٩.

[3] مزید معلومات کے لئے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ فرمائیں:صحیح بخاری، کتاب اشربہ ،مؤطا مالک جلد١ ص١٣٨ باب صلوۃ علی النبیؐ، اسدالغابۃ جلد٥ ص٩٠، مسند احمد جلد٤ ص ٣٢، الاستیعاب (الاصابۃ) کے حاشیے میں جلد٣ ص ٦٣١، فتح الباری جلد١ صفحہ ٢٨١ اور ٢٨٢.تاثیر رکھنے میں خدا سے بے نیاز ہے .

گزرتا ہوں تو اس دیوار اور اس دیوار کے بوسے لیتا ہوں اس دیار کی محبت نے میرے دل کو لبھایا نہیں ہے بلکہ اس دیار کے ساکن کی محبت نے میرے قلب کو اسیر کر لیا ہے۔

اکیسواں سوال

کیا اسلام کی نگاہ میں دین سیاست سے جدا نہیں ہے؟

جواب: اس سوال کے جواب سے قبل بہتر یہ ہے کہ پہلے سیاست کے معنی کو واضح کردیا جائے تاکہ دین اور سیاست کا رابطہ سمجھ میں آسکے یہاں سیاست کے دو معنی بیان کئے جاتے ہیں. ا۔ سیاست کے یہ معنی مراد لئے جائیں کہ اپنے ہدف تک پہنچنے کے لئے ہر قسم کے وسیلے کو اختیار کیا جائے چاہے وہ وسیلہ دھوکہ اور فریب کاری ہی کیوں نہ ہو (یعنی مقصد کے حصول کے لئے کسی بھی چیز کو وسیلہ بنایا جاسکتا ہے) واضح ہے کہ اس قسم کی سیاست دھوکے اور فریب سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے اور ایسی سیاست کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲۔ سیاست کے یہ معنی مراد لئے جائیں کہ اسلامی اصولوں کے مطابق انسانی معاشرے کے نظام کو چلایا جائے اس قسم کی سیاست کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے نظام کو قرآن اور سنت کی روشنی میں چلایا جائے ایسی سیاست دین کا حصہ ہے اور ہرگز اس سے جدا نہیں ہے.اب ہم یہاں پر سیاست اور دین کے درمیان رابطے اور حکومت کو تشکیل دینے سے متعلق چند دلیلیں پیش کریں گے : اس سلسلے میں واضح ترین گواہ پیغمبر خداؐ کا عمل ہے پیغمبر خداؐ کے اقوال اور کردار کے مطالعے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنی دعوت اسلام کے آغاز ہی سے ایک ایسی مضبوط حکومت قائم کرنے کا ارادہ کرلیا تھا جس کی بنیاد خدا پر ایمان کے محکم عقیدہ پر استوار تھی اور جو اسلام کے مقاصد کو پورا کرسکتی تھی یہاں پر بہتر ہے کہ ہم رسول خداؐ کے اس عزم و ارادہ کے سلسلے میں چند شواہد پیش کریں: پیغمبر خداؐ اسلامی حکومت کے بانی ہیں ا۔ جس وقت رسول خدا [ص] کو حکم ملا کہ لوگوں کو کھلم کھلا طریقے سے اسلام کی دعوت دیں تو اس وقت آنحضرتؐ نے مختلف طریقوں سے جہاد و ہدایت کے زمینے کو ہموار کیا اور اسلامی سپاہیوں کی تربیت اور ان کی آمادگی کا بیڑا اٹھایا اس سلسلے میں آپ نزدیک اور دور سے زیارت کعبہ کے لئے آنے والے افراد سے ملاقات کرتے تھے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دیتے تھے اسی دوران آپؐ نے مدینے کے دو گروہوں سے عقبہ کے مقام پر

ملاقات کی اور ان سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ لوگ آنحضرتؐ کو اپنے شہر میں بلائیں گے اور آپ کی حمایت کریں[1] اور اس طرح اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے آنحضرتؐ کی سیاست کا آغاز ہوا.

۲۔ رسول خداؐ نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد ایک ایسی مضبوط فوج تیار کی جس نے بیاسی جنگیں لڑیں اور ان جنگوں میں کامیابی حاصل کر کے اسلامی حکومت کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو ہٹا دیا.

۳۔ مدینے میں اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد آنحضرتؐ نے اس زمانے کی سیاسی اور اجتماعی بڑی طاقتوں کے پاس اپنے سفیر اور خطوط بھیج کر ان سے رابطہ قائم کیا اور بہت سے قبیلوں کے سربراہوں سے اقتصادی، سیاسی اور فوجی معاہدے کئے تاریخ نے پیغمبر خداؐ کے ان خطوط کی خصوصیات و تفصیلات کو بیان کیا ہے جو آپؐ نے ایران کے شہنشاہ ''کسریٰ''، روم کے بادشاہ ''قیصر''، مصر کے بادشاہ ''مقوقس''، حبشہ کے بادشاہ ''نجاشی'' اور دوسرے بادشاہوں کو بھیجے تھے. بعض محققین نے آنحضرتؐ کے ان خطوط کو اپنی مستقل کتابوں میں جمع کیا ہے[2]۔

۴۔ رسول خداؐ نے اسلام کے مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے اور اسلامی حکومت کے استحکام کے لئے بہت سے قبیلوں اور شہروں کے لئے حکام معین فرمائے تھے ہم یہاں اس سلسلے میں بطور مثال ایک نمونے کا ذکر کرتے ہیں پیغمبر اسلامؐ نے رفاعہ بن زید کو اپنا نمائندہ بنا کر انھیں ان کے اپنے قبیلے کی طرف روانہ کیا اور خط میں یوں تحریر فرمایا '': بسم اللہ الرحمن الرحیم، (ھذا کتاب) من محمد رسول اللہ [ص] لرفاعۃ بن زید بعثتہ اِلیٰ قومہ عامۃ و من دخل فیھم یدعوھم اِلیٰ اللہ والیٰ رسولہ فمن اقبل منھم ففي حزب اللہ و حزب رسولہ و من أدبر فلہ أمان شہرین[3]'' شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بہت مہربان اور نہایت ہی رحم کرنے والا ہے محمد رسول خداؐ کی طرف سے یہ نوشتہ رفاعہ بن زید کے نام، بے شک میں انہیں ان کی قوم کے عام لوگوں اور قوم میں شامل ہوجانے والوں کی طرف بھیج رہا ہوں تاکہ وہ انہیں خدا اور اس کے رسول کی طرف دعوت دیں پس جس نے ان کی دعوت کو قبول کیا وہ خدا اور اس

---

[1] سیرہ ہشام جلد۱ ص۴۳۱ مبحث عقبہ اولی طبع دوم مصر
[2] جیسے کہ ''الوثائق السیاسیہ'' (مؤلفہ محمد حمید اللہ) ''مکاتیب الرسول''(مؤلفہ علی احمدی) ہیں.
[3] مکاتیب الرسول جلد ۱ ص ۱۴۴.

کے رسول کے گروہ میں شامل ہو گیا.اور جو ان کی دعوت سے روگردانی کرے گا اس کے لئے صرف دو ماہ کی امان ہے .

پیغمبر اسلامؐ کے ان اقدامات سے بخوبی یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ بعثت کے آغاز ہی سے ایک ایسی مضبوط حکومت بنانا چاہتے تھے کہ جس کے سائے میں انسانی معاشرے کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے متعلق، اسلام کے احکام کونافذ کیا جا سکے، اب سوال یہ ہے کہ رسول خداؐ کا مختلف گروہوں اور قدرتمند قبیلوں سے معاہدہ کرنا ،ایک مضبوط فوج تیار کرنا، مختلف ممالک میں سفیر بھیجنا اور اس زمانے کے بادشاہوں کو خبردار کرنا، نیز ان سے خط و کتابت کرنا ساتھ ہی ساتھ شہروں کے گورنر اور حکام معین کرنا اور ایسے ہی دوسرے امور کا انجام دینا اگر سیاست نہیں تھا تو اور کیا تھا؟

پیغمبر اسلامؐ کی سیرت کے علاوہ خلفائے راشدین کا کردار اور خاص طور پر حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب ـ کا طرز عمل بھی شیعوں اور اہل سنت دونوں فرقوں کیلئے اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ سیاست دین سے جدا نہیں ہے.دونوں اسلامی فرقوں کے علماء نے حکومت قائم کرنے کے سلسلے میں قرآن مجید اور سنت پیغمبرؐ سے مفصل دلیلیں بیان کی ہیں نمونے کے طور پر ہم ان میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں:ابوالحسن ماوردی نے اپنی کتاب ''احکام سلطانیہ'' میں یوں لکھا ہے'':الإمامة موضوعة لخلافة النبوة في حراسة الدين و سياسة الدنيا و عقدها لمن يقوم بها في الأمة واجب بالإجماع[1]''امامت کو نبوت کی جانشینی کے لئے قرار دیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ دین کی حفاظت کی جا سکے اور دنیا کی سیاست و حکومت کا کام بھی چل سکے امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایسی حکومت قائم کرنا اس شخص پر واجب ہوجاتا ہے جو اس کام کو انجام دے سکتا ہو۔اہل سنت کے مشہور عالم ماوردی نے اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لئے دو طرح کی دلیلیں پیش کی ہیں:۱۔ عقلی دلیل ۲۔ شرعی دلیل

عقلی دلیل کو اس طرح بیان کرتے ہیں'':لما في طباع العقلاء من التسليم لزعيم يمنعهم من التظالم و يفعل بينهم في التنازع والتخاصم ولولا الولاة لكانوا فوضیٰ مهملين همجاً مضاعين[2]''کیونکہ یہ بات عقلاء کی فطرت میں ہے کہ وہ کسی رہبر کی پیروی کرتے ہیں تاکہ وہ انہیں ایک

---

[1] الاحکام السلطانية (ماوردی) باب اول ص۵ طبع مصر.
[2] الاحکام السلطانية (ماوردی) باب اول ص۵ طبع مصر.

دوسرے پر ظلم و ستم کرنے سے روکے اور اختلاف اور جھگڑوں کی صورت میں ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرے اور اگر ایسے حکام نہ ہوتے تولوگ پراگندہ اور پریشان ہوجاتے اور پھر کسی کام کے نہ رہ جاتے.اور شرعی دلیل کو اس طرح بیان کرتے ہیں'' :ولکن جاء الشرع بتفویض الأمور الی ولیہ في الدین قال اللہ عزّوجلّ (یا أیُّھا الَّذِین آمَنُوا أَطِیعُوا اللہَ وَأَطِیعُوا الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمرِ مِنْکُمْ)ففرض علینا طاعۃ أولي الأمر فینا وھم الأئمۃ المأتمرون علینا[1]''،لیکن شرعی دلیل میں یہ ہے کہ دین کے امور کو ولی کے سپرد کردیا گیا ہے خداوند کریم فرماتا ہے:ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمہیں میں سے ہیں پس خداوند نے ہم پر صاحبان امر کی اطاعت کو واجب کردیا ہے اور وہ ہمارے امام ہیں جو ہم پر حکومت کرتے ہیں.

شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے فضل بن شاذان سے ایک روایت نقل کی ہے جو ہمارے آٹھویں امام علی بن موسیٰ الرضا ـ کی طرف منسوب ہے اس طولانی روایت میں امام ـ نے حکومت قائم کرنے کو ایک لازمی امر قرار دیا ہے. ہم اس روایت کے چند جملے ذکر کرتے ہیں'' : إنا لا نجد فرقۃ من الفرق ولا ملۃ من الملل بقوا و عاشوا إلاّ بقیّم و رئیس، لما لابدّ لھم منہ من أمر الدین والدنیا، فلم یجز فیحکمۃ الحکیمأن یترک الخلق لما یعلم انہ لابدّ لھم منہ والإقوام لھم إلاّ بہ فیقاتلون بہ عدوھم و یقسمون بہ فیءھم و یقیمون بہ جمعتھم و جماعتھم و یمنع ظالمھم من مظلومھم[2] ''،ہمیں کوئی ایسی قوم یا ملت نہیں ملے گی جو اس دنیا میں باقی رہی ہواور اس نے زندگی گزاری ہو سوائے یہ کہ اس کے پاس ایک ایسا رہبر اور رئیس رہا ہو جس کے وہ لوگ دین اور دنیا کے امور میں محتاج رہے ہوں پس خداوند حکیم کی حکمت سے یہ بات دور ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ایک ایسی چیز عطا نہ فرمائے جسکے وہ لوگ محتاج ہیں اور اسکے بغیر باقی نہیں رہ سکتے ہیں کیونکہ لوگ اپنے رہبر ہی کی ہمراہی میں اپنے دشمنوں کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور اسی کے حکم سے مال غنیمت کو تقسیم کرتے ہیں اور اس کی اقتداء میں نماز جمعہ اور بقیہ نمازیں باجماعت ادا کرتے ہیں اور رہبر ہی ظالموں سے مظلوموں کو بچاتا ہے.اس سلسلے میں وارد ہونے والی ساری روایتوں کی تشریح کرنا اور تمام مسلمان فقہاء کے اقوال کا جائزہ لینا اس مختصر کتاب کی گنجائش سے باہر ہے اس کام کے

---

[1] الاحکام السلطانیۃ (ماوردی) باب اول ص۵ طبع مصر.
[2] علل الشرائع باب ۱۸۲ حدیث نمبر۹ ص ۲۵۳

لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ اسلامی فقہ کا دقت کے ساتھ مطالعہ کرنے سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ شریعت کے بہت سے قوانین ایسے ہیں جو ایکمضبوط حکومت کے بغیر نافذ نہیں کئے جا سکتے ہیں۔اسلام ہمیں جہاد اور دفاع کرنے ، ظالم سے انتقام لینے اور مظلوم کی حمایت کرنے، شرعی حدود اور تعزیرات جاری کرنے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر انجام دینے، ایک مالی نظام برقرار کرنے اور اسلامی معاشرے میں وحدت قائم کرنے کا حکم دیتا ہے اب یہ بات واضح ہے کہ مذکورہ اہداف ایک مضبوط نظام اور حکومت کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے کیونکہ شریعت کی حمایت اور اسلام سے دفاع کرنے کے لئے ایک تربیت یافتہ فوج کی ضرورت ہوتی ہے اور اس قسم کی طاقتور فوج تیار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی اصولوں کے مطابق ایک مضبوط حکومت قائم کی جائے اور اسی طرح فرائض کی پابندی اور گناہوں سے دوری کے لئے حدود اور تعزیرات کو جاری کرنا اور ظالموں سے مظلوموں کا حق لینا ایک حکومت اور نظام کے بغیر ممکن نہیں ہے کیونکہ اگر قوی حکومت نہ پائی جاتی ہو تو معاشرہ فتنہ اور آشوب کی آماجگاہ بن جائے گا اگرچہ حکومت قائم کرنے کے لازمی ہونے کے سلسلے میں ہماری ان دلیلوں کے علاوہ بھی بہت سی دلیلیں ہیں لیکن ان دلیلوں ہی سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نہ صرف دین سیاست سے جدا نہیں ہے، بلکہ شریعت کے قوانین کے مطابق اسلامی حکومت قائم کرنا ایک لازمی امر ہے جو کہ اس دنیا میں پائے جانے والے ہر اسلامی معاشرہ کے لئے ایک فریضہ قرار دیا گیا ہے۔

بائیسواں سوال

شیعہ، حضرت علی بن ابی طالب کے بیٹوں (امام حسن[ع]اور امام حسین[ع]) کو رسول خدا [ص]کے بیٹے کیوں کہتے ہیں؟

جواب: تفسیر،تاریخ اور روایات کی کتابوں کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ صرف شیعہ ہی یہ نظریہ نہیں رکھتے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سارے مسلمان محققین چاہے وہ کسی بھی اسلامی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں، اسی نظرئیے کو قبول کرتے ہیں.اب ہم قرآن مجید،احادیث اور مشہور مفسرین کے اقوال کی روشنی میں اس مسئلے کے دلائل کو بیان کریں گے: قرآن مجید کی ایک اصل یہ ہے کہ اس نے ایک انسان کی نسل سے پیدا ہونے والی اولاد کو اسی انسان کی اولاد قرار دیا ہے اس اعتبار سے ایک انسان کی بیٹی یا اس کے بیٹے سے پیدا ہونے والی اولاد قرآن مجید کی نگاہ میں اس انسان کی اولاد ہے۔

قرآن مجید اور سنت پیغمبرؐ میں اس حقیقت کے متعلق بہت سے شواہد موجود ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں: ۱۔مندرجہ ذیل آیت میں قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ ـ کو حضرت ابراہیم ـ کی اولاد میں شمار کیاہے جبکہ حضرت عیسیٰ ـ حضرت مریمؑ کے بیٹے ہیں اور ان کا سلسلہ نسب ماں کے ذریعہ حضرت ابراہیم ـ تک پہنچتا ہے:(وَوَہَبْنَا لَہُ إِسْحَاقَ وَیَعْقُوبَ کُلاًّ ہَدَیْنَا وَنُوحًا ہَدَیْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّیَّتِہِ دَاوُودَ وَسُلَیْمَانَ وَأَیُّوبَ وَیُوسُفَ وَمُوسَی وَہَارُونَ وَکَذَلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِینَ * وَزَکَرِیَّا وَیَحْیَی وَعِیسَی[۱]) اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب دیئے اور سب کو ہدایت بھی دی اور اس کے پہلے نوح کو ہدایت دی اور پھرابراھیم کی اولاد میں داؤد، سلیمان، ایوب،یوسف، موسیٰ، اور ہارون قراردیئے اور ہم اسی طرح نیک عمل کرنے والوں کو جزا دیتے ہیں اور (اسی طرح ابراہیم کی اولاد میں سے) زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ ہیں۔

مسلمان علماء اس آیۂ شریفہ کو اس بات پر شاہد قرار دیتے ہیں کہ امام حسن اور امام حسین ۲۲۸ رسول خداؐ کی اولاد اورآپؐ کی ذریت میں سے ہیں نمونے کے طور پر ہم یہاں ان علماء میں سے ایک عالم کے کلام کو پیش کرتے ہیں :جلال الدین سیوطی لکھتے

---

[۱] سورہ انعام آیت : ۸۴ اور ۸۵

ہیں ''أرسل الحجاج إلی یحییٰ بن یعمر فقال: بلغني أنک تزعم أن الحسن والحسین من ذریۃ النبي [ص] تجدہ في کتاب اللہ و قد قرأتہ من أولہ إلیٰ آخرہ فلم أجدہ قال: ألست تقرأ سورۃ الانعام (وَمِن ذُرِّیَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَیْمَانَ) حتی بلغ یَحْیَیٰ وَعِیسَیٰ؟ قال بلیٰ قال: ألیس عیسیٰ من ذریۃ إبراهیم و لیس لہ أب؟ قال: صدقتَ[1]'' حجاج نے یحییٰ بن یعمر کے پاس پیغام بھیجا اور ان سے یہ کہا مجھے خبر ملی ہے کہ تم یہ گمان کرتے ہو کہ حسن اور حسین ۲۲۸ نبی اکرمؐ کی ذریت میں سے ہیں کیا تم نے اس بات کو کتاب خدا سے حاصل کیا ہے جبکہ میں نے قرآن مجید کو اول سے آخر تک پڑھا ہے لیکن میں نے کوئی ایسی بات اس میں نہیں دیکھی ہے. یحییٰ بن یعمر نے کہا کیا تم نے سورہ انعام نہیں پڑھا ہے جس میں یہ ہے ''وَمِن ذُرِّیَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَیْمَانَ'' یہاں تک کہ خدا فرماتا ہے و یَحْیَیٰ وَعِیسَیٰ؟'' حجاج نے کہا کیوں نہیں پڑھی ہے یحییٰ نے کہا کیا حضرت عیسیٰ ۔ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں سے نہ تھے جب کہ ان کا کوئی باپ نہ تھا (اور ان کا سلسلہ نسب ماں کے ذریعہ حضرت ابراہیمؑ تک پہنچتا ہے) حجاج نے جواب میں کہا کہ تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو. مذکورہ آیت اور مفسرین کے اقوال سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوجاتی ہے کہ نہ صرف شیعہ بلکہ تمام مسلمان علماء امام حسن اور امام حسین ۲۲۸ کو رسول خداؐ کی ذریت اور اولاد سمجھتے ہیں.

۲۔ اس قول کے صحیح ہونے پر ایک بہت ہی واضح دلیل آیہ مباہلہ ہے اب ہم اس آیت کو مفسرین کے اقوال کے ساتھ پیش کرتے ہیں: (فَمَن حَاجَّکَ فِیهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَکُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَکُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَی الْکَاذِبِینَ[2]) (اے پیغمبر) علم کے آجانے کے بعد جو لوگ آپ سے کٹ حجتی کریں ان سے کہہ دیجئے کہ آؤ ہم لوگ اپنے اپنے بیٹوں، اپنی اپنی عورتوں اور اپنے اپنے نفسوں کو بلائیں اور پھر خدا کی بارگاہ میں دعا کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت قرار دیں. مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت ''مباہلہ'' کے نام سے مشہور ہے یہ آیت عیسائیوں کے سرداروں سے مناظرہ کرنے کے سلسلہ میں اس وقت نازل ہوئی جب وہ کٹ حجتی سے باز نہ آئے اور آنحضرتؐ حکم خدا سے حضرت علی بن ابی طالب، حضرت فاطمہ زہرا، حضرت امام حسن

[1] تفسیر در المنثور جلد۳ ص۲۸ طبع بیروت سورہ انعام کی ۸۴ اور ۸۵ آیت کی تفسیر کے ذیل میں.

[2] سورہ آل عمران آیت : ۶۱

اور حضرت امام حسین [ع]کی ہمراہی میں مباھلہ کے لئے تشریف لے گئے اور جب نصاری کے بزرگوں نے پیغمبر خداؐ اور ان کے اہل بیت [ع]کی یہ شان اور ہیبت دیکھی تو وہ سب خوفزدہ ہوگئے اور آنحضرتؐ کی خدمت میں آکر یہ التماس کرنے لگے کہ آنحضرتؐ ان پر لعنت نہ کریں آنحضرت نے ان کی درخواست قبول کر لی اور ان کے ساتھ ایک معاہدہ کر کے اس قصے کو ختم کردیا شیعہ اور سنی علماء اس بات پر اتفاق نظر رکھتے ہیں کہ مباہلہ کے دن حضرت امیرالمومنین ، حضرت فاطمہ ، حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین [ع]رسول خداؐ کے ہمراہ تھے اس سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ''ابنائنا '' (یعنی ہمارے فرزند) سے رسول خدا [ص]کی مراد امام حسن اور ، امام حسین ۲۲۸ ہیں اس سے یہ بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ آیہ مباہلہ نے بھی حضرت امام حسن اور امام حسین ۲۲۸ کو رسول خدا کا فرزند قرار دیا ہے. یہاں پر اس نکتے کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ مفسرین نے آیہ مباہلہ کے ذیل میں بہت سی روایات ذکر کرنے کے بعد اس قول کے صحیح ہونے کی گواہی دی ہے نمونے کے طور پر ہم ان میں سے بعض مفسرین کے کلام کی طرف اشارہ کرتے ہیں: الف: جلال الدین سیوطی نے حاکم، ابن مردویہ ،اور ابونعیم سے اور انہوں نے جابر بن عبداللہ سے نقل کیا ہے : وہ کہتے ہیں: (أنفسنا و أنفسکم)رسول اللہ [ص]و علی، ''ابنائنا '' الحسن والحسین و ''نسائنا ''فاطمہ' (انفسنا) '' (یعنی ہماری جانوں) سے مراد رسول خدا [ص]اور حضرت علی ۔ ہیں اور (ابنائنا)(یعنی ہمارے بیٹوں) سے مراد حسن و حسین ۲۲۸ ہیں اور (نسائنا)(ہماری عورتوں)سے مراد فاطمہ زہرا ۲۳۶ ہیں۔

ب: فخر رازی اپنی تفسیر میں اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں : واعلم ان ھذہ الروایۃ کالمتفق علیٰ صحتھا بین اھل التفسیر والحدیث [2]جان لو کہ یہ روایت ایسی حدیث ہے کہ جس کے صحیح ہونے پر اہل تفسیر اور اہل حدیث کا اتفاق ہے۔اور پھر اس کے بعد یوں کہتے ہیں'' المسألۃ الرابعۃ: ھذہ الآیۃ دالۃ علی أن الحسن والحسین ۲۲۸ کانا ابني رسول اللہ [ص]وعد أن یدعوا أبناءہ فدعا الحسن

---

[1] تفسیر در المثور جلد ۲ ص ۳۹ طبع بیروت اسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں.
[2] تفسیر ''مفاتیح الغیب '' جلد ۲ ص ۴۸۸ طبع ۱ول مصر ۱۳۰۸ ھ.

والحسین فوجب أن یکون ابنیه[1]'' یہ آیہ کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حسن اور حسین پیغمبر اکرمؐ کے فرزند تھے طے یہ ہوا تھا کہ رسول خداؐ اپنے بیٹوں کو بلائیں پس آنحضرتؐ نے حسنؑ و حسینؑ ہی کو بلایا تھا پس یہ ثابت ہوگیا کہ وہ دونوں آنحضرتؐ کے بیٹے ہیں۔

ج:ابو عبداللہ قرطبی اپنی تفسیر میں تحریر کرتے ہیں کہ: (أبنائنا)دلیل علیٰ أن أبناء البنات یسمون أبناءا[2]. کلمہ ابنائنا دلیل ہے کہ بیٹی سے ہونے والی اولاد بھی انسان کی اولاد کہلاتی ہے۔

۳۔رسول خدا [ص]کے اقوال شاہد ہیں کہ امام حسن اور امام حسین ۸ ۲۲آنحضرتؐ کے فرزند تھے،یہاں پر ہم آنحضرتؐ کے صرف دو اقوال کی طرف اشارہ کرتے ہیں: الف:رسول خداؐ حسنؑ اور حسینؑ کے متعلق فرماتے ہیں: هذان ابنای مَن أحبهما فقد أحبني[3]. حسن اور حسین میرے دو فرزند ہیں جس نے ان سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی.

ب:پیغمبر اسلام نے حسن اور حسین ۸ ۲۲کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :إن إبنيّ هٰذین ریحانتي من الدنیا[4]. میرے یہ دو بیٹے اس دنیا سے میرے دو پھول ہیں۔

---

[1] تفسیر ''مفاتیح الغیب '' جلد ۲ ص ۴۸۸ طبع ۱ول مصر ۱۳۰۸ ھ.
[2] الجامع لاحکام القرآن جلد ۴ ص ۱۰۴طبع بیروت.
[3] تاریخ مدینہ دمشق مصنفہ ابن عساکر ترجمۃ الامام الحسین ۔ ص۵۹حدیث ۱۰۶طبع اول بیروت ۱۴۰۰ ھ.
[4] گذشتہ حوالہ ص۶۲ حدیث نمبر ۱۱۲.

تیئیسواں سوال

شیعوں کے نزدیک یہ کیوں ضروری ہے کہ خلیفہ کو خدا اور رسولؐ ہی معین فرمائیں؟

جواب: یہ واضح ہے کہ اسلام ایک ہمیشہ رہنے والا عالمی دین ہے پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ میں آپ ہی امت کے رہبر اور ہادی تھے لیکن آپ کی رحلت کے بعد ضروری تھا کہ جو سب سے زیادہ لائق فرد ہو اسے امت اسلامیہ کی رہبری سونپ دی جائے.

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا پیغمبر اسلامؐ کے بعد خلیفہ، نص کے ذریعہ معین کیا جائے گا (یعنی خدا اور رسول ہی اپنا خلیفہ معین فرمائیں گے)یا یہ کہ خلافت ایک انتخابی عہدہ ہے ؟اس سلسلہ میں چند نظریے پائے جاتے ہیں شیعوں کا اعتقاد ہے کہ منصب خلافت نص کے ذریعہ معین ہوتا ہے یعنی یہ ضروری ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا جانشین خدا کی جانب سے معین کیا جائے ۔

جب کہ اہل سنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ منصب خلافت ایک انتخابی عہدہ ہے اور ضروری ہے کہ پیغمبر خداؐ کی امت، مملکت کے امور کو چلانے کے لئے کسی ایک شخص کو خلیفہ چن لے.عصر رسالت کے حالات کا تجزیہ بتاتا ہے کہ خلیفہ کو نص کے ذریعہ معین ہونا چاہئے.شیعہ علماء نے عقائد کی کتابوں میں خلیفہ کے نص کے ذریعہ معین کئے جانے کے بارے میں بہت سے دلائل بیان کئے ہیں لیکن وہ دلیل جسے یہاں بیان کیا جاسکتا ہے اور جس سے شیعوں کا عقیدہ بھی واضح ہوجاتا ہے وہ عصر رسالت کے حالات کا صحیح تجزیہ ہے.عصر رسالت میں اسلام کی داخلی اور خارجی سیاست کا یہ تقاضا تھا کہ پیغمبر خداؐ کا جانشین خدا کی طرف سے خود آنحضرتؐ کے ذریعہ معین کیا جائے کیونکہ مسلمانوں کو ہر لحظہ تین بڑی طاقتوں (روم کی سلطنت، ایران کی بادشاہت اور منافقین حجاز کی سازشوں)کی طرف سے شکست اور نابودی کا خطرہ لاحق تھا اسی طرح امت کی کچھ مصلحتیں بھی تقاضا کررہی تھیں کہ پیغمبر اسلامؐ اپنا خلیفہ معین کر کے ساری امت کو بیرونی دشمن کی طاقت کے مقابلے میں ایک صف میں کھڑا کردیں اور اس طرح ملت اسلامیہ کو ان داخلی اختلافات سے بچالیں جن سے دشمنوں کے نفوذ اور تسلط کا موقع فراہم ہوسکتا ہے ۔

اس کی وضاحت ان تین خطرناک طاقتوں میں سے ایک طاقت روم کی بادشاہی تھی جس سے پیغمبر اسلامؐ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک فکر مند رہے ہجرت کے آٹھویں سال فلسطین کی سرزمین پر مسلمانوں اور روم کے عیسائیوں کے درمیان پہلی جنگ ہوئی تھی اس جنگ میں اسلامی فوج کے تین کمانڈر ''جعفر طیار'' ''زید بن حارثہ''اور ''عبداللہ بن رواحہ'' شہید ہوئے تھے اور سپاہ اسلام کو اس جنگ میں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا. کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کی اس شکست سے قیصر روم کی فوج کے حوصلے بڑھ گئے تھے اور ہر وقت اس بات کا ڈر رہتا تھا کہ کہیں وہ اسلام کے مرکزی علاقوں پر حملہ آور نہ ہوجائیں ۔

اسی وجہ سے پیغمبر اسلامؐ نے ہجرت کے نویں سال مسلمانوں کے ایک بڑے لشکر کو شام کے اطراف میں بھیجا تھا اور ارادہ یہ تھا کہ اگر جنگ کی نوبت آگئی توآنحضرتؐ خود لشکر اسلام کی رہبری فرمائیں گے اس درد و رنج والے سفر میں سپاہ اسلام نے اپنی سابقہ شوکت پھر سے حاصل کی اور اسے اس کا سیاسی مقام و منصب دوبارہ مل گیا پیغمبر اسلامؐ اس فتح کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوئے اور آپؐ نے اپنی بیماری سے چند دن پہلے مسلمانوں کی فوج کو ''اسامہ''کی قیادت میں شام کی طرف جانے کا حکم دیا.

عصر رسالت میں مسلمانوں کی دوسری دشمن طاقت ایران کی بادشاہی تھی یہاں تک کہ ایران کے بادشاہ نے انتہائی غصے سے آنحضرتؐ کے خط کو پھاڑ دیا تھا اور آپؐ کے ایلچی کو توہین کے ساتھ باہر نکال دیا تھا اور نیز یمن کے گورنر کو خط لکھا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ کو گرفتار کرلے اور ممانعت کی صورت میں انہیں قتل کرڈالے.

اگرچہ ایران کا بادشاہ خسرو پرویز رسول خداؐ کے زمانے ہی میں مر گیا تھا لیکن مدتوں سے ایران کے زیر اقتدار رہنے والے ملک یمن کا مسلمانوں کے ذریعہ استقلال حاصل کرلینا ایرانی بادشاہوں کو شدید ناگوار گزرا اس وجہ سے ایران کی سطوت شاہی کے لئے اسلام کی طاقت کو پھلتا پھولتا دیکھنا برداشت کے قابل نہیں تھا. مسلمانوں کو تیسرا خطرہ منافقین کے گروہ سے تھا منافقوں کی ہمیشہ سے یہ کوشش تھی کہ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اندازی کے ذریعہ فتنہ و فساد پیدا کریں ان لوگوں کے نفاق اور کینہ کا اس بات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے تبوک سے مدینہ کے راستے میں حضرت رسول اکرم [ص]کو قتل کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا یہ لوگ سمجھ

رہے تھے کہ رسول خداؐ کی رحلت سے اسلام کی تحریک ختم ہوجائے گی اور وہ لوگ آسودہ خاطر ہوجائیں گے منافقین کے عزائم اور ان کی سازشوں کو آشکار کرنے کے لئے قرآن مجید نے ان سورتوں : آل عمران ، نساء ، مائدہ، انفال ، توبہ، عنکبوت، احزاب، محمد، فتح، مجادلہ، حدید، منافقین اور حشر میں ان کا تذکرہ فرمایا ہے![1] اسلام کے ایسے سرسخت اور خطرناک دشمنوں کی موجودگی میں کیا یہ صحیح تھا کہ رسول خداؐ تازہ مسلمانوں کے دینی اور سیاسی امور کی رہبری کے لئے اپنا کوئی جانشین معین نہ فرماتے؟اس وقت کے اجتماعی حالات کے مطالعہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ ضروری تھا کہ رسول خداؐ اپنے بعد اپنا جانشین معین کرکے ہر قسم کے اختلاف کا سد باب کردیتے اور ایک مستحکم دفاعی نظام تشکیل دیتے ہوئے اسلامی وحدت کو دوام بخشتے اگر آنحضرتؐ اپنا کوئی خلیفہ معین نہ فرماتے تو عالم اسلام کو شدید قسم کے ناگوار واقعات کا سامنا کرنا پڑتا اور نتیجۃ ہر گروہ یہ کہنے لگتا کہ خلیفہ ہم میں سے ہونا چاہئے.

رسول خدا [ص] کی حدیثیں

اجتماعی حالات کے تقاضوں اور چند دوسری وجوہات کی بنیاد پر آنحضرت [ص] نے اول بعثت سے لے کر اپنی زندگی کے آخری ایام تک اپنی جانشینی کے مسئلے کو بیان فرمایا ہے آپؐ نے دعوت ذوالعشیرہ میں جہاں اپنی رسالت کا اعلان فرمایا وہیں اپنے جانشین کو بھی معین فرما دیا تھا اور اسی طرح اپنی زندگی کے آخری ایام میں حجۃالوداع سے لوٹتے وقت غدیر خم کے میدان میں اپنے جانشین کا اعلان فرمایا تھا اورنہ صرف ان دو مقامات پر بلکہ آنحضرتؐ اپنی ساری زندگی کے دوران مختلف مقامات پر اپنے جانشین کی شناخت کراتے رہے مزید تفصیلات کے لئے اسی کتاب میں تیسرے سوال کے جواب کا مطالعہ فرمائیں ہم نے وہاں پیغمبر اسلامؐ کی حدیثوں کے تین ایسے نمونے ذکر کئے ہیں جن میں آنحضرت کے جانشین کا تذکرہ ہے وہاں ہم نے ان حدیثوں کے ماخذ بھی ذکر کئے ہیں . صدر اسلام کے حالات اور پیغمبر اسلامؐ کی ان حدیثوں (جن میں آنحضرت [ص] نے حضرت علی ـ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا ہے) کے مطالعے سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ خلیفہ خدا و رسول ہی کی طرف سے معین ہوتا ہے۔

---

[1] فروغ ابدیت ، مولف استاد جعفر سبحانی(اقتباس)

چوبیسواں سوال

کیا غیر خدا کی قسم کھانا شرک ہے؟

جواب: لفظ توحید اور شرک کے معنی جاننے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کی آیات اور حدیثوں کا مطالعہ کیا جائے کیونکہ قرآن مجید اور سنت رسول حق کو باطل سے اور توحید کو شرک سے جدا کرنے کا بہترین معیار ہیں. اس بنیاد پر بہتر ہے کہ ہر قسم کے نظریہ اور عمل کو قرآن اور سنت پیغمبر کی روشنی میں زندہ اور بے تعصب ضمیر کے ساتھ پرکھیں اب ہم یہاں پر قرآن و سنت سے غیر خدا کی قسم کھانے کے جائز ہونے پر چند دلیلیں پیش کریں گے: ا۔ قرآن مجید میں چند محترم مخلوقات جیسے ''پیغمبر اکرمؐ ''اور ''روح انسان'' ''قلم'' ''سورج'' ''چاند'' ''ستارے'' ''دن اور رات'' ''آسمان اور زمین'' ''زمانے'' ''پہاڑ اور سمندر'' وغیرہ کی قسم کھائی گئی ہے یہاں ہم ان میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں: الف: (لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ[1])(پیغمبرؐ!) آپ کی جان کی قسم یہ لوگ اپنی خواہش نفس کے نشے میں اندھے ہورہے ہیں.

ب: (وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَاهَا وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّاهَا وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا[2]...) آفتاب اور اس کی روشنی کی قسم. اور چاند کی قسم جب وہ اس کے پیچھے چلے. اور دن کی قسم جب وہ روشنی بخشے.اور رات کی قسم جب وہ اسے ڈھانک لے. اور آسمان کی قسم اور جس نے اسے بنایا. اور زمین کی قسم اور جس نے اسے بچھایا . اور نفس کی قسم اور جس نے اسے درست کیا. پھر بدی اور تقوی کی ہدایت دی ہے.

ج: (وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَى[3]) قسم ہے ستارے کی جب وہ ٹوٹا.

د: (وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ[4])

---

[1] سورہ حجر آیت ۷۲
[2] سورہ شمس آیت ۱ تا ۸
[3] سورہ نجم آیت:۱
[4] سورہ قلم آیت:۱

ھ: (وَالْعَصْرِ ةِ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ [۱]) قسم ہے عصر کی. بے شک انسان خسارے میں ہے.

و: (وَالْفَجْرِ ةِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ [۲]) قسم ہے فجر کی. اور دس راتوں کی.ز: (وَالطُّورِ ةِ وَكِتَابٍ مَّسْطُورٍ ةِ فِي رَقٍّ مَّنشُورٍ ةِ وَالْبَيْتِ الْمَعْمُورِ ةِ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوعِ ةِ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُورِ [۳]) طور کی قسم. اور لکھی ہوئی کتاب کی قسم. جو کشادہ اوراق میں ہے. اور بیت معمور کی قسم. اور بلند چھت (آسمان) کی قسم. اور بھڑکتے ہوئے سمندر کی قسم.اسی طرح ان سورتوں ''نازعات''، ''مرسلات''، ''بروج''، ''طارق''، ''بلد''، ''تین''، ''ضحی''، میں بھی دنیا کی مختلف اشیاء کی قسمیں کھائی گئی ہیں.

اگر غیر خدا کی قسم کھانا شرک ہوتا تو اس قرآن مجید میں جو توحید کا مظہر ہے، ہرگز غیر خدا کی قسمیں نہ کھائی جاتیں اور اگر اس قسم کی قسمیں کھانا صرف خداوند کی خصوصیات میں سے ہوتا تو قرآن مجید میں ضرور اس بات کی طرف متوجہ کرادیا جاتا تاکہ بعد میں کسی کو دھوکہ نہ ہو. ـ دنیا کے سارے مسلمان رسول خداؐ کو اپنے لئے اسوہ عمل سمجھتے ہیں اور آنحضرتؐ کی سیرت کو حق اور باطل کی شناخت کے لئے میزان قرار دیتے ہیں.

عالم اسلام کے محققین اور اہل سنت کی صحیح اور مسند کتابوں کے مؤلفین نے پیغمبر خداؐ کی بہت سی ایسی قسموں کو نقل کیا ہے جو حضور اکرمؐ نے غیر خدا کے نام سے کھائی تھیں.احمد بن حنبل نے اپنی کتاب مسند میں پیغمبر اسلامؐ سے یوں روایت کی ہے '': فلعمري لأن تکلم بمعروف و تنهیٰ عن منکر خیر من أن تسکت [۴]''. میری جان کی قسم !تمہارے خاموش رہنے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ تم امر بمعروف اور نھی از منکر کرو. مسلم بن حجاج کا اپنی کتاب صحیح میں بیان ہے کہ: جاء رجل إلی النبي [ص]فقال: یا رسول اللہ أيّ الصدقة أعظم أجرا؟ فقال: أما و أبیک لتنبأنہ أن تصدق و أنت صحیح شحیح تخشي الفقر و تأمل البقاء.[۵] ایک شخص نبی اکرم [ص]کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ کونسا صدقہ زیادہ اجر رکھتا ہے ؟پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: تمہارے باپ کی قسم یقیناً تمہیں معلوم ہوجائے گا

---

[۱] سورہ عصر آیت ۱ اور۲.
[۲] سورہ فجر آیت : ۱ اور ۲.
[۳] سورہ طور آیت نمبر ۱ سے ۶ تک.
[۴] مسند احمد جلد ۵ ص ۲۲۴ اور ۲۲۵ حدیث بشیر ابن خصاصیہ سدوسی.
[۵] صحیح مسلم، جزء سوم ، طبع مصر ، کتاب الزکاة، باب بیان ان افضل الصدقۃ ، صدقۃ الصحیح الشحیح، ص ۹۳ اور ۹۴

کہ (سب سے زیادہ اجر والا صدقہ) یہ ہے کہ تم صحت مندی، آرزوئے حیات، خوف فقر اور امید بقاء کے ساتھ صدقہ دو. جو لوگ دنیا کے اکثر مسلمانوں کو صرف اس وجہ سے مشرک سمجھتے ہیں کہ وہ سب غیر خدا کی قسم کھاتے ہیں تو وہ پیغمبر خدا کے اس عمل کی کیا تاویل کریں گے ؟

۳۔ کتاب خدا اور سنت پیغمبرؐ کے علاوہ رسول خداؐ کے انتہائی قریبی اور معتبر اصحاب کی سیرت بھی اس عمل کے جائز ہونے کی بہترین دلیل ہے. عالم اسلام کے عظیم الشأن رہبر حضرت علی بن ابی طالب۔ نے اپنے بہت سے گہربار خطبوں اور بیانات میں اپنی جان کی قسم کھائی ہے وہ فرماتے ہیں: ولعمري ليضعفن لكم التيه من بعدي أضعافا[1] میری جان کی قسم میرے بعد تمہاری یہ حیرانی اور سرگردانی کئی گنا بڑھ جائے گی ۔ ایک جگہ اور فرماتے ہیں ''؛ ولعمري لأن لم تنزع عن غيک و شقاقک لتعرفنهم عن قليل يطلبونک[2]'' میری جان کی قسم اگر تم اپنی گمراہی اور شقاوت سے دست بردار نہ ہوئے تو عنقریب انہیں دیکھو گے کہ وہ لوگ تمہیں بھی ڈھونڈ لیں گے[3]. اب واضح ہے کہ ان سب روایات کے مقابلے میں اجتہاد اور استحسان کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور کوئی بھی دلیل قرآن مجید کی آیتوں، پیغمبر اکرمؐ کی سنت اور معتبر صحابہ کی سیرت کو غلط قرار نہیں دے سکتی اور نہ ہی ان کی طرف شرک کی نسبت دے سکتی ہے۔

نتیجہ: گزشتہ دلائل کے مجموعے سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ قرآن و سنت اور مومنین کی سیرت کے اعتبار سے غیر خدا کی قسم کھانا ایک جائز اور مسلم اصل کی حیثیت رکھتا ہے اور کسی بھی طرح عقیدہ توحید سے نہیں ٹکراتا. لہذا اگر کوئی روایت ظاہری طور پر ان یقینی دلیلوں کی مخالفت کرے تو اس کی تاویل کرنی چاہیے تاکہ وہ قرآن و روایات کی مسلم اصل کے موافق ہوجائے. بعض اوقات ایک ایسی مبہم سی روایت کو پیش کیا جاتا ہے جس میں اس عمل کی مخالفت کی گئی ہے یہاں ہم اس روایت کو اسکے جواب کے ساتھ بیان کرتے ہیں: اِن رسول اللہ سمع عمر و ھویقول : وأبي، فقال: اِن اللہ ینھاکم أن تحلفوا بآبائکم و من کان حالفاً فلیحلف

[1] نہج البلاغہ (محمد عبدہ) خطبہ نمبر ۱۶۱.
[2] نہج البلاغہ (محمد عبدہ) مکتوب نمبر ۹.
[3] اور زیادہ موارد کی آگاہی کے لئے خطبہ نمبر ۱۶۸،۱۸۲،اور ۱۸۷ اورمکتوب نمبر ۶ اور ۵۴ کی طرف رجوع فرمائیے.

باللہ أو یسکت[1] رسول خدا [ص] نے حضرت عمر کو یہ کہتے ہوئے سنا میرے باپ کی قسم (یہ سن کر) پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا خداوند کریم نے تم لوگوں کو اپنے باپ کی قسم کھانے سے منع کیا ہے اور جسے قسم کھانا ہو وہ خدا کی قسم کھائے یا پھر چپ رہے.

اگرچہ یہ حدیث قرآن کی ان آیات اور روایات کے مقابلے میں جو غیر خدا کی قسم کھانے کو جائز قرار دیتی ہیں، کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے لیکن پھر بھی اس حدیث کو آیات اور روایات کے ہمراہ لانے کے لئے یہ کہنا ضروری ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے حضرت عمر اور ان جیسے افراد کو اپنے باپ کی قسم کھانے سے اس لئے روکا تھا کہ ان کے باپ مسلمان نہیں تھے اور غیر مسلموں کی قسمیں نہیں کھائی جا سکتیں۔

[1] سنن الکبری ، جلد ۱۰ ص ۲۹ اور سنن نسائی جلد۷ صفحہ نمبر۵ اور ۶.

پچیسواں سوال

کیا اولیائے خدا سے توسل کرنا شرک اور بدعت ہے؟

جواب:توسل کے معنی یہ ہیں کہ تقرب الہی کے لئے کسی محترم مخلوق کو اپنے اور خدا کے درمیان وسیلہ قرار دیا جائے. ابن منظور لسان العرب میں لکھتے ہیں'' : توسّل الیہ بکذا ، تقرب الیہ بحرمۃ آصرۃ تعطفہ علیہ[۱]''اس نے فلان چیز کے ذریعہ اس شخصیت سے توسل کیا یعنی اس نے اس چیز کی حرمت کے ذریعہ اس ذات سے قربت اختیار کی جب کہ اس کی حرمت سے اپنی قلبی محبت کو اپنے اندر محسوس کیا. قرآن مجید فرماتا ہے:(یاأیُّہا الَّذِین آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہ وَابْتَغُوا إِلَیہِ الْوَسِیلۃَ وَجَاہِدُوا فِي سَبِیلِہِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُون[۲]) ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو کہ شاید اس طرح کامیاب ہوجاؤ. جوہری ''صحاح اللغۃ'' میں ''وسیلہ'' کی تعریف کو یوں بیان کرتے ہیں'':الوسیلۃ ما یتقرّب بہ الی الغیر''وسیلہ ایسی چیز ہے جسکے ذریعہ کسی دوسرے کے قریب ہوا جائے اس اعتبار سے بعض اوقات انسان کے نیک اعمال اور خدا کی خالص عبادت اس کیلئے وسیلہ بنتے ہیں اور کبھی کبھی خدا کے محترم اور مقدس بندے انسان کے لئے وسیلہ قرار پاتے ہیں.

توسل کی قسمیں

توسل کی تین قسمیں ہیں:۱۔نیک اعمال سے توسل ؛جلال الدین سیوطی نے اس آیت (وَابْتَغُوا إِلَیہِ الْوَسِیلَۃَ) کے ذیل میں اس روایت کا ذکرکیا ہے:عن قتادۃ في قولہ تعالیٰ''وَابْتَغُوا إِلَیہِ الْوَسِیلَۃَ''قال : تقرّبوا اِلی اللّٰہ بطاعتہ والعمل بما یرضیہ[۳] (وَابْتَغُوا إِلَیہِ الْوَسِیلَۃَ)اس آیت کے متعلق قتادۃ کا بیان ہے . کہ خدا کی اطاعت اور اس کو خوشنود کرنے والے عمل کے ذریعہ خدا سے قربت اختیار کرو.

۲۔خدا کے نیک بندوں کی دعاؤں سے توسل !قرآن مجید نے جناب یوسف۔ کے بھائیوں اور جناب یعقوبؑ کی گفتگو کو یوں بیان کیا

---

[۱] لسان العرب، جلد ۱۱ ص ۷۳۴

[۲] سورہ مائدہ آیت:۳۵.

[۳] تفسیر درالمنثور جلد۲ ص ۲۸۰مطبوعہ بیروت اسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں.

ہے: (قَالُوا یاأَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا کُنَّا خَاطِئِینَ قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَکُمْ رَبِّی إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِیمُ[1]) ان لوگوں نے کہا بابا جان اب آپ ہمارے گناہوں کیلئے استغفار کریں ہم یقیناً خطاکار تھے انہوں نے کہاکہ میں عنقریب تمہارے حق میں استغفار کروں گا کہ میرا پروردگار بہت بخشنے والا اور مہربان ہے. اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ جناب یعقوب ـ کے بیٹوں نے اپنے والد کی دعا اور ان کے استغفار سے توسل کیا تھا حضرت یعقوب ـ نے بھی نہ صرف ان کے توسل پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ ان سے وعدہ بھی کیا کہ وہ ان کے حق میں دعا اور استغفار کریں گے.

۳ـ قرب الٰہی کے حصول کیلئے خداوند کریم کے محترم اور مقدس بندوں سے توسل :اس قسم کے توسل کی مثالیں، اوائل اسلام میں آنحضرتؐ کے اصحاب کی سیرت میں دکھائی دیتی ہیں اب ہم یہاں اس مسئلے کی دلیلوں کو احادیث اور سیرت صحابہ کی روشنی میں پیش کرتے ہیں. احمد ابن حنبل نے اپنی کتاب مسند میں عثمان بن حنیف سے یہ روایت نقل کی ہے: اِن رجلاً ضریر البصر أتی النبیّ[ص]فقال ادع اللّٰہ أن یعافینی قال: اِن شئت دعوت لک و اِن شئت أخرت ذاک فھو خیر فقال ادعہ فأمرہ أن یتوضأ فیحسن وضوءہ فیصلی رکعتین و یدعو بھذا الدعاء: اللّٰھم اِنیّ أسئلک و أتوجہ اِلیک بنبیک محمدِ نبیّ الرحمۃ یا محمد اِنیّ توجّھت بک اِلیٰ ربیّ فی حاجتی ھذہ ، فتقضی لی اللّٰھم شفعہ فیّ[2].ایک نابینا شخص رسول خدا [ص]کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپؐ پروردگار سے دعاکیجئے کہ وہ مجھے شفا بخشے آنحضرت نے فرمایا اگر تم چاہتے ہو تو میں تمہارے لئے دعا کرتا ہوں لیکن اگر چاہو تو اس سلسلے میں کچھ تاخیر کردی جائے اور یہی بہتر بھی ہے اس نے عرض کیا کہ آپؐ دعا فرمادیں تو پیغمبر خداؐ نے اس شخص کو حکم دیا کہ وہ وضو کو اچھے طریقے سے انجام دے اور پھر دو رکعت نماز بجا لائے اور یہ دعا پڑھے :اے معبود میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں تیرے پیغمبر نبی رحمتؐ حضرت محمدؐ کے وسیلے سے اے محمدؐ میں آپکے وسیلے سے اپنی اس حاجت میں اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تاکہ آپ میری حاجت کو قبول فرمائیں اے معبود ان کو میرے لئے شفیع قرار دے.

---

[1] سورہ یوسف آیت نمبر ۹۷ اور ۹۸.

[2] مسند احمد بن حنبل ، جلد ۴ ص ۱۳۸ روایات عثمان بن حنیف ،مستدرک حاکم ؛ جلد ۱ کتاب صلوۃ التطوع طبع بیروت ۳۱۳،سنن ابن ماجہ جلد ۱ ص ۴۴۱طبع دار احیاء الکتب العربیہ، ''التاج '' جلد ۱ ص ۲۸۶،الجامع الصغیر (سیوطی) ص ۵۹،التوسل و الوسیلہ (ابن تیمیہ) ص ۹۸طبع بیروت.

محدثین نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے جیسا کہ حاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب مستدرک میں اس حدیث کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ ''یہ ایک صحیح حدیث ہے'' ابن ماجہ نے بھی ابو اسحاق سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ : ''یہ روایت صحیح ہے'' اسی طرح ترمذی نے اپنی کتاب ''ابواب الادعیہ'' میں اس حدیث کے صحیح ہونے کی تائید کی ہے ''محمد بن نسیب الرفاعی'' نے بھی اپنی کتاب ''التوصل الی حقیقۃ التوسل'' میں یوں بیان کیا ہے لاشک اِن ھذا الحدیث صحیح و مشھور ...و قد ثبت فیہ بلا شک ولاریب ارتداد بصر الأعمی بدعاء رسول اللہ [ص]بے شک یہ حدیث صحیح اور مشہور ہے...بہ تحقیق اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول خدا [ص]کی دعا کے نتیجے میں اس اندھے شخص کی بصارت لوٹ آئی تھی اس حدیث سے اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ حاجات کے لئے پیغمبر خداً کو وسیلہ بنا کر ان سے توسل کرنا ایک جائز عمل ہے کیونکہ رسول خدا نے اس نابینا شخص کو حکم دیا تھا کہ وہ اس طرح دعا کرے اور حضور (ص) کو اپنے اور پروردگار کے درمیان وسیلہ قرار دے اس طرح یہ حدیث اولیائے الٰہی سے توسل کو ثابت کرتی ہے۔[1]

٢۔ابوعبداللہ بخاری کا اپنی کتاب صحیح میں بیان ہے : اِن عمربن الخطاب رضي اللہ عنہ کان اِذا قحطوا استقیٰ بالعباس بن عبدالمطلب فقال : اللّھم اِن کنّا نتوسّل اِلیک بنبیّنا فتسقینا و اِنا نتوسّل اِلیک بعمّ نبیّنا فاسقنا : قال، فیُسقون.[2] جب قحط پڑتا تھا تو عمر ابن خطاب ہمیشہ عباس ابن عبدالمطلب کے وسیلے سے بارش کیلئے دعا کرتے تھے اور کہتے تھے ''خدایا !پیغمبر کے زمانے میں ہم آنحضرتؐ سے متوسل ہوتے تھے اور تو ہم پر بارش نازل کرتا تھا اب ہم پیغمبرؐ کے چچا کے وسیلے سے تجھ سے توسل کررہے ہیں تاکہ تو ہمیں سیراب کردے'' چنانچہ اس طرح وہ سیراب کردئیے جاتے تھے۔

٣۔صدر اسلام کے مسلمانوں کے درمیان اولیائے الٰہی سے توسل اس حد تک رائج تھا کہ وہ لوگ اپنے اشعار میں بھی حضورؐ کے وسیلہ ہونے کا تذکرہ کرتے تھے بطور مثال سواد ابن قارب کا یہ قصیدہ ملاحظہ فرمائیں جس میں انہوں نے حضور اکرم [ص]کی مدح سرائی

[1] التوصل الی حقیقۃ التوسل ص ١٥٨ طبع بیروت.
[2] صحیح بخاری جز ٢ کتاب الجمعہ باب الاستسقاء ص ٢٧ طبع مصر.

کی ہے: واشهد أن لاربّ غیره وأنک مأمون علیٰ کل غالبو أنک أدنیٰ المرسلین وسیلۃاِلی اللّٰہ یابن الأکرمین الأطائب[1] میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے علاوہ کوئی پروردگار نہیں ہے اور آپؐ ہر پوشیدہ چیز کے لئے امین ہیں اور اے مکرم اور پاک طینت افراد کے فرزند میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ تمام نبیوں کے درمیان پروردگار کا نزدیک ترین وسیلہ ہیں.پیغمبر خدا نے سواد بن قارب سے یہ قصیدہ سنا تھا لیکن اس کے اشعار پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور نہ ہی سواد کے اس کام کو شرک و بدعت قرار دیا تھا.امام شافعی نے بھی اپنے ان اشعار میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے: آل النبيّ ذریعتي هم الیه وسیلتي أرجوبهم أعطی غدًا بیدي الیمین صحیفتي[2]پروردگار تک پہنچنے کے لئے پیغمبر کی آل میرے لئے وسیلہ ہیں میں ان کی وجہ سے امیدوار ہوں کہ میرا نامہ اعمال میرے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا.اولیائے الہی سے توسل کے جائز ہونے کے سلسلے میں بہت سی روایات آئی ہیں اور انہی روایات کی روشنی میں پیغمبر خداؐ صحابہ اور علمائے اسلام کا اس موضوع سے متعلق نظریہ معلوم ہوجاتا ہے اور مزید گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں رہتی ہے ۔ ہمارے اسی بیان سے ان لوگوں کا یہ کلام کہ خدا کے محترم بندوں سے توسل کرنا شرک اور بدعت ہے، باطل ہوجاتا ہے ۔

[1] الدر السنیہ ،مؤلفہ سید احمد بن زینی دحلان ص ۲۹ طبرانی سے نقل کرتے ہوئے.
[2] الصواعق المحرقہ ،مؤلفہ ابن حجر عسقلانی ص ۱۷۸طبع قاہرہ.

چھبیسواں سوال

کیا اولیائے خدا کی ولادت کے موقع پر جشن منانا بدعت یا شرک ہے؟

جواب:خدا کے نیک بندوں کی یاد منانا اور ان کی ولادت کے موقعے پر جشن منانا ، عقلاء کی نظر میں ایک واضح مسئلہ ہے لیکن پھر بھی ہم اس عمل کے جائز ہونے کی دلیلیں اس لئے پیش کررہے ہیں تاکہ کسی قسم کا شبہ باقی نہ رہ جائے.۱۔ان کی یاد منانے میں محبت کا اظہار ہوتا ہے.قرآن مجید نے مسلمانوں کو پیغمبر خداؐ اور ان کے اہل بیت[ع]سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے: (قُلْ لاأَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْراً إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ[1]) (اے پیغمبر)آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس تبلیغ رسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ میرے اقربا سے محبت کرو.اس میں شک نہیں ہے کہ مسلمان اولیاء خدا کی یاد منا کر ان سے اپنی اس محبت و الفت کا اظہار کرتے ہیں جس کا حکم قرآن مجید نے دیا ہے.

۲۔پیغمبر اکرمؐ کی یاد منانا آنحضرتؐ کی تعظیم کا اظہار ہےقرآن مجید نے رسول خدا کی نصرت کرنے کے علاوہ آپ کے احترام کو بھی کامیابی اور سعادت کا معیار قرار دیا ہے.(فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ[2])پس جو لوگ پیغمبر پر ایمان لائے اور ان کا احترام کیا،ان کی امداد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو ان کے ساتھ نازل ہوا ہے وہی در حقیقت فلاح یافتہ اور کامیاب ہیں.گزشتہ آیت کی روشنی میں بخوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں پیغمبراکرمؐ کا احترام انتہائی پسندیدہ کام ہے اور ان کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھنے اور ان کے بلند مقام کی تعظیم کے لئے جشن منانا خداوندعالم کی خوشنودی کا باعث بنتا ہے کیونکہ اس آیت میں فلاح یافتہ لوگوں کے لئے چار صفات ذکر کی گئی ہیں:الف:ایمان(الَّذِينَ آمَنُوا بِهِ) وہ لوگ نبیؐ پر ایمان لائے.

ب:ان کے نور کی پیروی (وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ) اور اس نور کی پیروی کی جو ان کے ساتھ نازل ہوا.

---

[1] سورہ شوریٰ آیت :۲۳
[2] سورہ اعراف آیت: ۱۵۷

ج:ان کی نصرت کرنا (وَنَصَرُوہ) اورانہوں نے ان کی نصرت کی.د:پیغمبراکرمؐ کی تعظیم(وعَزَّروہ) اور ان کا احترام کیا.

اس اعتبارسے پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لانے اور ان کی نصرت کرنے اور ان کے دئیے ہوئے احکام کی پیروی کرنے کے علاوہ آنحضرتؐ کا احترام اورآپؐ کی تعظیم بھی ایک ضروری امر ہے اس لحاظ سے حضور سرورکائناتؐ کی یاد کو باقی رکھنا ''وَعَزَّرُوہُ'' کے امر کا امتثال ہے.

۳۔انکی یاد منانے میں خداوندعالم کی پیروی ہے.خداوندعالم قرآن مجید میں پیغمبراکرمؐ کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(وَ رَفَعْنا لَکَ ذِکْرَکَ[1]) اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا ذکر بلند کردیا.اس آیت کی روشنی میں معلوم ہوجاتا ہے کہ خداوندعالم یہ چاہتا ہے کہ پیغمبراکرمؐ کی عظمت و جلال کو اس دنیا میں پھیلا دے اور خود ذات کردگار نے بھی قرآن مجید میں آنحضرتؐ کی تعظیم کی ہے اس لئے ہم بھی قرآن مجید کی پیروی کرتے ہوئے پیغمبراکرمؐ جوکہ اسوہ کمال و فضیلت ہیں کی یاد منا کر ان کی تعظیم کرتے ہیں.اور اس طرح پروردگار عالم کی پیروی کرتے ہیں.واضح ہے کہ مسلمانوں کا ان محافل کو منعقد کرنے کا مقصد پیغمبراکرمؐ کے ذکر کو بلند کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے.

۴۔وحی کا نازل ہونا دسترخوان کے نازل ہونے سے کم نہیں ہے قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ ۔کی دعا کو یوں بیان کیا ہے:(قَالَ عِیسَی ابْنُ مَرْیَمَ اللّٰھُمَّ رَبَّنَا أَنزِلْ عَلَیْنَا مَاءِدَۃً مِنَ السَّمَاءِ تَکُونُ لَنَا عِیدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآیَۃً مِّنکَ وَارْزُقْنَا وَأَنتَ خَیْرُ الرَّازِقِینَ[2]) عیسیٰ ابن مریم نے کہا اے خدا!اے ہمارے پروردگار!ہم پر آسمان سے دسترخوان نازل فرما تاکہ ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لئے عید ہوجائے اور تیری طرف سے نشانی بن جائے.

حضرت عیسیٰ ۔نے خداوندعالم سے درخواست کی تھی کہ ان پر آسمان سے ایک دسترخوان نازل کیا جائے تاکہ اس کے نازل ہونے کادن ان کیلئے عید بن جائے.اب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ جب خدا کے ایک نبی کی نگاہ میں دسترخوان (جس سے جسمانی لذت

---

[1] سورہ انشراح آیت ۴
[2] سورہ مائدہ آیت : ۱۱۴

حاصل ہوتی ہے) کے نازل ہونے کا دن عید ہے تو اب اگر دنیا کے مسلمان وحی کے نازل ہونے اور (پیغمبر اکرمؐ جو انسانوں کی بخشش کا ذریعہ اور حیات ابدی کا سرچشمہ ہیں) کی ولادت با سعادت کے دن کو عید قرار دیتے ہوئے اس دن جشن منائیں اور محفلیں منعقد کریں تو کیا یہ شرک یا بدعت ہوجائے گا ؟!

۵ ۔ مسلمانوں کی سیرت دین اسلام کے پیرو پیغمبر اکرمؐ کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے مدتوں سے اس قسم کی جشن منعقد کرتے آرہے ہیں اس سلسلے میں حسین بن محمد دیاربکری اپنی کتاب ''تاریخ الخمیس'' میں یوں لکھتے ہیں '': ولایزال أهل الاسلام یحتفلون بشهر مولده علیه السلام و یعملون الولائم و یتصدقون في لیالیه بأنواع الصدقات و یظهرون السرور و یزیدون في المبرات و یعتنون بقراءة مولده الکریم و یظهر علیهم من برکاته کل فضل عمیم[1]'' دنیا کے مسلمان ہمیشہ سے پیغمبر اکرمؐ کی ولادت کے مہینے میں جشن کی محفلیں منعقد کرتے ہیں اور لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں اس مہینے کی راتوں میں طرح طرح کے صدقے دیتے ہیں اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور بہت زیادہ نیکیاں انجام دیتے ہیں وہ لوگ بڑے اہتمام کے ساتھ ان کی ولادت کی مناسبت سے قصیدے پڑھتے ہیں اور ان کی برکت سے ان پر ہر قسم کے فضل ظاہر ہوتے ہیں.

اس بیان سے واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن اور مسلمانوں کی نگاہ میں اولیائے خدا کی یاد منانا ایک پسندیدہ اور جائز عمل ہے اور ساتھ ہی ساتھ اولیائے خدا کی یاد منانااور اسی طرح یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ وہ لوگ جو اولیائے خدا کی یاد منانے کو شرک سمجھتے ہیں ان کا یہ دعوی بے بنیاد اور بے دلیل ہے اور اسی کے ساتھ اولیاء خدا کی یاد منانے کو بدعت سمجھنے والے لوگوں کا نظریہ بھی باطل ہوجاتا ہے کیونکہ یہ فعل اس وقت بدعت قرار پاتا جب اس عمل کا جائز ہونا ، خصوصی یا عمومی طور پر قرآن وسنت سے ثابت نہ ہوتا جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں کلی طور پر اس مسئلہ کا حکم موجود ہے اور مسلمانوں کی سیرت میں بھی اس کے نقوش ملتے ہیں. اسی طرح یہ محفلیں خدا کے نیک بندوں کو خدا کی مخلوق اور اس کا محتاج سمجھتے ہوئے صرف ان کے احترام کی خاطر منعقد کی جاتی ہیں,اس

[1] حسین بن محمد بن حسن دیار بکری ، تاریخ الخمیس جلد ١ ص ٢٢٣ طبع بیروت.

اعتبار سے یہ عمل توحید سے مکمل طور پر مطابقت رکھتا ہے. اور یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ وہ لوگ جو اولیاے خدا کی یاد منانے کو شرک سمجھتے ہیں ان کا یہ دعوی بے بنیاد اور بے دلیل ہے۔

ستائیسواں سوال

شیعہ پانچ نمازوں کو تین اوقات میں کیوں پڑھتے ہیں؟

جواب: بہتر ہے کہ اس بحث کی وضاحت کے لئے سب سے پہلے اس بارے میں فقہاء کے نظریات بیان کردئیے جائیں:

۱۔سارے اسلامی فرقے اس مسئلہ پر متفق ہیں کہ میدان ''عرفات'' میں ظہر کے وقت نماز ظہر اور نماز عصر کو اکھٹا اور بغیر فاصلے کے پڑھا جاسکتا ہے اسی طرح ''مزدلفہ'' میں عشا کے وقت نماز مغرب اور عشا کو ایک ساتھ پڑھنا جائز ہے.

۲۔حنفی فرقہ کا کہنا ہے کہ : نماز ظہر و عصر اور نماز مغرب و عشاء کو اکھٹا ایک وقت میں پڑھنا صرف دو ہی مقامات ''میدان عرفات'' اور ''مزدلفہ'' میں جائز ہے اور باقی جگہوں پر اس طرح ایک ساتھ نمازیں نہ پڑھی جائیں.

۳۔حنبلی، مالکی اور شافعی فرقوں کا کہنا ہے کہ: نماز ظہر و عصر اور نماز مغرب و عشاء کو ان گزشتہ دو مقامات کے علاوہ سفر کی حالت میں بھی ایک ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے ان فرقوں میں سے کچھ لوگ بعض اضطراری موقعوں جیسے بارش کے وقت یا نمازی کے بیمار ہونے پر یا پھر دشمن کے ڈر سے ان نمازوں کو ساتھ میں پڑھنا جائز قرار دیتے ہیں[1].

۴۔شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نماز ظہر و عصر اور اسی طرح نماز مغرب و عشاء کے لئے ایک ''خاص وقت'' ہے اور ایک ''مشترک وقت:''الف:نماز ظہر کا خاص وقت شرعی ظہر (زوال آفتاب) سے لیکر اتنی دیر تک ہے جس میں چار رکعت نماز پڑھی جا سکے.

ب: نماز عصر کا مخصوص وقت وہ ہے کہ جب غروب آفتاب میں اتنا وقت باقی بچا ہو کہ اس میں چار رکعت نماز پڑھی جا سکے.

ج:نماز ظہر و عصر کا مشترک وقت نماز ظہر کے مخصوص وقت کے ختم ہونے اور نماز عصر کے مخصوص وقت کے شروع ہونے تک ہے.شیعہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان تمام مشترک اوقات میں نماز ظہر و عصر کو اکٹھا اور فاصلے کے بغیر پڑھ سکتے ہیں.لیکن اہل سنت کہتے ہیں : کہ نماز ظہر کا مخصوص وقت، شرعی ظہر (زوال آفتاب) سے لیکر اس وقت تک ہے جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہوجائے

[1] ''الفقہ علی المذاهب الاربعہ'' کتاب الصلوۃ الجمع بین الصلا تین تقدیمًا و تاخیرًا ، سے اقتباس

اس وقت میں نماز عصر نہیں پڑھی جا سکتی اور اس کے بعد سے لے کر غروب آفتاب تک نماز عصر کا مخصوص وقت ہے اس وقت میں نماز ظہر نہیں پڑھی جا سکتی.

د :نماز مغرب کا مخصوص وقت شرعی مغرب کی ابتدا سے لے کر اس وقت تک ہے کہ جس میں تین رکعت نماز پڑھی جا سکتی ہے. اس وقت میں صرف نماز مغرب ہی پڑھی جا سکتی ہے.

ھ : نماز عشاء کا مخصوص وقت یہ ہے کہ جب آدھی رات میں صرف اتنا وقت رہ جائے کہ اس میں چار رکعت نماز پڑھی جا سکے تو اس کوتاہ وقت میں صرف نماز عشاء ہی پڑھی جائے گی۔

و : مغرب و عشاء کی نمازوں کا مشترک وقت نماز مغرب کے مخصوص وقت کے ختم ہونے سے لے کر نماز عشاء کے مخصوص وقت تک ہے.شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس مشترک وقت کے اندر مغرب و عشاء کی نمازیں ایک ساتھ اور بغیر فاصلے کے ادا کی جا سکتی ہیں لیکن اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ نماز مغرب کا مخصوص وقت غروب آفتاب سے لے کر مغرب کی سرخی زائل ہونے تک ہے اور اس وقت میں نماز عشاء نہیں پڑھی جا سکتی پھر مغرب کی سرخی کے زائل ہونے سے لیکر آدھی رات تک نماز عشاء کا خاص وقت ہے اور اس وقت میں نماز مغرب ادا نہیں کی جا سکتی.

نتیجہ :یہ نکلتا ہے کہ شیعوں کے نظرئیے کے مطابق شرعی ظہر کا وقت آجانے پر نماز ظہر بجالانے کے بعد بلافاصلہ نماز عصر ادا کر سکتے ہیں نماز ظہر کو اس وقت نہ پڑھ کر نماز عصر کے خاص وقت تک پڑھتے ہیں۔ اس طرح کہ نماز ظہر کو نماز عصر کے خاص وقت کے پہنچنے سے پہلے ختم کردیں اور اس کے بعد نماز عصر پڑھ لیں اس طرح نماز ظہر و عصر کو جمع کیا جا سکتا ہے اگرچہ مستحب یہ ہے کہ نماز ظہر کو زوال کے بعد ادا کیا جائے اور نماز عصر کو اس وقت ادا کیا جائے کہ جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہوجائے.اسی طرح شرعی مغرب کے وقت نماز مغرب کے بجالانے کے بعد بلا فاصلہ نماز عشا پڑھ سکتے ہیں یا پھر اگر چاہیں تو نماز مغرب کو نماز عشاء کے خاص وقت کے قریب پڑھیں وہ اس طرح کہ نماز مغرب کو نماز عشاء کے خاص وقت کے پہنچنے سے پہلے ختم کردیں اور اس کے بعد نماز

عشاء پڑھ لیں اس طرح نماز مغرب و عشاء کو ساتھ میں پڑھا جا سکتا ہے. اگرچہ مستحب یہ ہے کہ نماز مغرب کو شرعی مغرب کے بعد ادا کیا جائے اور نماز عشاء کو مغرب کی سرخی کے زائل ہوجانے کے بعد بجالایا جائے یہ شیعوں کو نظریہ تھا. لیکن اہل سنت کہتے ہیں کہ نماز ظہر و عصر یا مغرب و عشاء کو کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت میں ایک ساتھ ادا کرنا صحیح نہیں ہے اس اعتبار سے بحث اس میں ہے کہ کیا ہر جگہ اور ہر وقت میں دو نمازیں ایک ساتھ پڑھی جا سکتی ہیں ٹھیک اسی طرح جیسے میدان عرفہ اور مزدلفہ میں دو نمازوں کو ایک ساتھ ایک ہی وقت میں پڑھا جاتا ہے.

۵۔ سارے مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے دو نمازیں ایک ساتھ پڑھی تھیں لیکن اس روایت کی تفسیر میں دو نظرئیے پائے جاتے ہیں: الف: شیعہ کہتے ہیں کہ اس روایت سے مراد یہ ہے کہ نماز ظہر کے ابتدائی وقت میں ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد نماز عصر کو بجالایا جا سکتا ہے اور اسی طرح نماز مغرب کے ابتدائی وقت میں مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد نماز عشا کو پڑھا جا سکتا ہے اور یہ مسئلہ کسی خاص وقت اور کسی خاص جگہ یا خاص حالات سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر جگہ اور ہر وقت میں ایک ساتھ دو نمازیں ادا کی جا سکتی ہیں.

ب: اہل سنت کہتے ہیں مذکورہ روایت سے مراد یہ ہے کہ نماز ظہر کو اس کے آخری وقت میں اور نماز عصر کو اس کے اول وقت میں پڑھا جائے اور اسی طرح نماز مغرب کو اس کے آخری وقت میں اور نماز عشاء کو اس کے اول وقت میں پڑھا جائے.

اب ہم اس مسئلے کی وضاحت کے لئے ان روایات کی تحقیق کر کے یہ ثابت کریں گے کہ ان روایات میں دو نمازوں کو جمع کرنے سے وہی مراد ہے جو شیعہ کہتے ہیں. یعنی دو نمازوں کو ایک ہی نماز کے وقت میں پڑھا جا سکتا ہے اور یہ مراد نہیں ہے کہ ایک نماز کو اس کے آخری وقت میں اور دوسری نماز کو اس کے اول وقت میں پڑھا جائے: روایات میں دو نمازوں کے ایک ہی ساتھ پڑھنے کا تذکرہ ۱۔ احمد ابن حنبل نے اپنے کتاب مسند میں جابر بن زید سے روایت کی ہے أخبرني جابر بن زيد أنه سمع ابن عباس يقول: صلّيت مع رسول الله [ص] ثمانيا جميعا، و سبعا جميعا قال قلت له يا أبا الشعثاء أظنه أخّر الظهر و عجّل العصر و أخّر المغرب و عجّل العشاء قال وأنا أظن

ذلک.[1] جابر بن زید کا بیان ہے کہ انہوں نے ابن عباس سے سنا ہے کہ وہ کہہ رہے تھے : میں نے پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ آٹھ رکعت نماز (ظہر و عصر) اور سات رکعت نماز (مغرب و عشاء) کو ایک ساتھ پڑھا ہے ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے ابوشعثاء سے کہا : میرا یہ گمان ہے کہ رسول خداؐ نے نماز ظہر کو تاخیر سے پڑھا ہے اور نماز عصر کو جلد ادا کیا ہے اسی طرح نماز مغرب کو بھی تاخیر سے پڑھا ہے اور نماز عشاء کو جلدی ادا کیا ہے ابوشعثاء نے کہا میرا بھی یہی گمان ہے. اس روایت سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں کوایک ساتھ اور بغیر فاصلے کے پڑھا تھا.

۲۔احمد ابن حنبل نے عبداللہ بن شقیق سے درج ذیل روایت نقل کی ہے'': خطبنا ابن عباس یوما بعد العصر حتی غربت الشمس و بدت النجوم و علق الناس ینادونہ الصلاۃ و في القوم رجل من بني تمیم فجعل یقول: الصلاۃ الصلاۃ : قال فغضب قال أ تعلّمني بالسنۃ؟ شھدت رسول اللہ [ص] جمع بین الظہر والعصر والمغرب والعشاء. قال عبداللہ فوجدت في نفسي من ذلک شيءا فلقیت أباھریرۃ فسألتہ فوافقہ[2] ''ایک دن عصر کے بعد ابن عباس نے ہمارے درمیان خطبہ دیا یہاں تک کہ آفتاب غروب ہوگیا اور ستارے چمکنے لگے اور لوگ نماز کی ندائیں دینے لگے ان میں سے بنی تمیم قبیلے کا ایک شخص ''نماز '' ''نماز '' کہنے لگا ابن عباس نے غصے میں کہا کیا تم مجھے سنت پیغمبر کی تعلیم دینا چاہتے ہو؟ میں نے خود رسول خداؐ کو ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھتے دیکھا ہے عبداللہ نے کہا اس مسئلے سے متعلق میرے ذہن میں شک پیدا ہوگیا تو میں ابوہریرہ کے پاس گیا اور ان سے سوال کیا تو انہوں نے ابن عباس کی بات کی تائید کی. اس حدیث میں دو صحابی ''عبداللہ ابن عباس'' اور ''ابوہریرہ'' اس حقیقت کی گواہی دے رہے ہیں کہ پیغمبر اکرم [ص] نے نماز ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ پڑھا ہے اور ابن عباس نے بھی پیغمبر اکرمؐ کے اس عمل کی پیروی کی ہے.

[1] مسند احمد ابن حنبل ، جلد۱ ص ۲۲۱
[2] مسند احمد، جلد۱ ص ۲۵۱.

۳۔مالک بن انس کا اپنی کتاب ''موطأ'' میں بیان ہے:صلیٰ رسول اللہ [ص]الظہر والعصر جمیعًا والمغرب والعشاء جمیعًا في غیر خوف ولا سفر[1]رسول خدا [ص]نے ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازیں ایک ساتھ پڑھی تھیں جبکہ نہ تو کسی قسم کا خوف تھا اور نہ ہی آپؐ سفر میں تھے.

۴۔مالک بن انس نے معاذبن جبل سے یہ روایت نقل کی ہے: فکان رسول اللہ [ص] یجمع بین الظہر والعصر والمغرب والعشاء[2] رسول خدا [ص]نماز ظہر عصر اور نماز مغرب و عشاء کو ایک ساتھ بجالاتے تھے.

۵۔ مالک بن انس نے نافع سے اور انہوں نے عبداللہ بن عمر سے یوں روایت نقل کی ہے: کان رسول اللہ [ص]إذا عجّل به السیر یجمع بین المغرب والعشاء[3]. جس وقت رسول خداؐ کو کوئی مسافت جلدی طے کرنی ہوتی تو وہ مغرب و عشاء کی نمازوں کوایک ساتھ بجالاتے تھے.

٦۔مالک ابن انس نے ابوہریرہ سے یوں روایت نقل کی ہے: إن رسول اللہ [ص]کان یجمع بین الظہر والعصر في سفره إلی تبوک[4]پیغمبر اکرمؐ نے تبوک کے راستے میں ظہر و عصر کی نمازیں ایک ساتھ پڑھیں تھیں.

۷۔مالک نے اپنی کتاب موطأ میں نافع سے یوں روایت نقل کی ہے : إن عبداللہ بن عمر کان إذا جمع الأمراء بین المغرب والعشاء في المطر جمع معهم[5] جب بھی بارش کے دوران حکام مغرب اور عشاء کو اکھٹا پڑھتے تھے تو عبداللہ بن عمر بھی ان کے ساتھ اپنی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھ لیا کرتے تھے.

---

[1] موطأ مالک ، کتاب الصلوة طبع ٣ (بیروت) ص ١٢٥ حدیث ١٧٨ صحیح مسلم جلد ٢ ص ١٥١ طبع بیروت ، باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر.
[2] موطا مالک کتاب الصلوة صفحہ ١٣۴ حدیث ١٧٦ طبع ٣ بیروت سال طبع ١۴٠٣ھ. صحیح مسلم طبع مصر جز ٢ صفحہ ١٥٢.
[3] موطأ مالک کتاب الصلوة ص ١٢٥ حدیث ١٧٧.
[4] موطأ مالک کتاب الصلوة ص ١٢۴ حدیث ١٧٥.
[5] موطأ مالک کتاب الصلوة ص ١٢٥ حدیث ١٧٩.

۸۔مالک ابن انس نے علی بن حسین سے یوں نقل کیا ہے: کان رسول اللہ [ص]إذا أراد أن یسیر یومہ جمع بین الظہر والعصر و إذا أراد أن یسیر لیلہ جمع بین المغرب والعشاء پیغمبر اکرم ؐجب دن میں سفر کرنا چاہتے تھے تو ظہر اور عصر کی نمازوں کو اکھٹا ادا کرلیا کرتے تھے اور جب رات میں سفر کرنا ہوتا تھا تو مغرب اور عشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھتے تھے.

۹۔ محمد زرقانی نے موطأ کی شرح میں ابن شعثا سے یوں روایت نقل کی ہے اِن ابن عباس صلّیٰ بالبصرۃ الظہر والعصر لیس بینھما شيء والمغرب والعشاء لیس بینھما شيء [2] بے شک ابن عباس نے بصرہ میں نماز ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور بغیر فاصلے کے پڑھا تھا اور اسی طرح نماز مغرب وعشاء کو بھی اکھٹا اور بغیر فاصلے کے بجالائے تھے.

۱۰۔زرقانی نے طبرانی سے اور انھوں نے ابن معود سے نقل کیا ہے : جمع النبيّ [ص]بین الظہر والعصر و بین المغرب والعشاء فقیل لہ في ذلک فقال : صنعت ھذا لئلا تحرج أمتي [3] پیغمبر اکرمؐ نے جب نماز ظہر و عصر اور نماز مغرب و عشاء کو ایک ساتھ پڑھا تو آنحضرتؐ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اس عمل کو اس لئے انجام دیا ہے تاکہ میری امت مشقت میں نہ پڑ جائے.

۱۱۔مسلم بن حجاج نے ابوزبیر سے اور انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے ابن عباس سے یوں روایت نقل کی ہے: صلّیٰ رسول اللہ [ص]بین الظہر والعصر جمیعًا بالمدینۃ في غیر خوف ولاسفر [4] پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ منورہ میں بغیر خوف و سفر کے نماز ظہر و عصر کوایک ساتھ پڑھا تھا.اس کے بعد ابن عباس نے پیغمبر اکرمؐ کے اس عمل کے بارے میں کہا کہ: آنحضرت چاہتے تھے کہ ان کی امت میں سے کوئی بھی شخص مشقت میں نہ پڑنے پائے [5]

---

[1] موطأ مالک، کتاب الصلوۃ ص ۱۲۵ حدیث ۱۸۱.
[2] موطأپرزرقانی کی شرح ، جز اول باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر والسفر ص ۲۹۴طبع مصر.
[3] گزشتہ حوالہ.
[4] صحیح مسلم جزء ۲ ص ۱۵۱ باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر ،طبع مصر.
[5] یہ مطلب گزشتہ کتاب میں اسی حدیث کے ذیل میں مذکور ہے.

١٢۔ مسلم نے اپنی کتاب صحیح میں سعید بن جبیر سے اور انہوں نے ابن عباس سے یوں روایت نقل کی ہے: جمع رسول اللہ [ص] بین الظہر والعصر والمغرب والعشاء في المدینة من غیر خوف ولامطر! پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ منورہ میں بغیر خوف اور بارش کے نماز ظہر و عصر اور نماز مغرب و عشاء کو اکھٹا پڑھا تھا. اس وقت سعید ابن جبیر نے ابن عباس سے پوچھا کہ پیغمبر اکرمؐ نے اس طرح کیوں کیا؟ تو ابن عباس نے کہا آنحضرتؐ اپنی امت کو زحمت میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے[1].

١٣۔ ابوعبداللہ بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں اس سلسلے میں ''باب تأخیر الظہر الی العصر'' کے نام سے ایک مستقل باب قرار دیا ہے[2]. یہ خود عنوان اس بات کا بہترین گواہ ہے کہ نماز ظہر میں تاخیر کرکے اسے نماز عصر کے وقت میں اکھٹا بجالایا جاسکتا ہے اس کے بعد بخاری نے اسی مذکورہ باب میں درج ذیل روایت نقل کی ہے: إن النبيّ [ص] صلّیٰ بالمدینة سبعا و ثمانیا الظہر والعصر والمغرب والعشاء[3] بہ تحقیق پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ میں سات رکعت (نماز مغرب و عشاء) اور آٹھ رکعت (نماز ظہر و عصر) پڑھی ہیں. اس روایت سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ جس طرح نماز ظہر میں تاخیر کرکے اسے نماز عصر کے وقت میں نماز عصر کے ساتھ بجالایا جاسکتا ہے، اسی طرح سیاق حدیث میں موجود قرینہ اور پیغمبر اکرمؐ کی سیرت سے سمجھ میں آتاہے کہ نماز مغرب میں بھی دیر کر کے اسے نماز عشاء کے وقت میں نماز عشاء کے ساتھ بجالایا جاسکتا ہے.

١٤۔ بخاری نے اپنی کتاب صحیح میں ایک اور مقام پر لکھاہے: قال ابن عمر و أبو أیوب و ابن عباس رضي اللہ عنھم صلّیٰ النبيّ [ص] المغرب والعشاء[5] عبد اللہ بن عمر و ابوایوب انصاری اور عبداللہ بن عباس نے کہا ہے کہ: پیغمبر خداؐ نے مغرب اور عشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھا ہے. بخاری اس حدیث سے مسلم طور پر یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ پیغمبر اکرمؐ نے نماز مغرب و عشاء کو ایک ساتھ پڑھا تھا کیونکہ یہ تو یقینی ہے کہ بخاری ہرگز اس حدیث کے ذریعے حضورؐ کے نمازی ہونے کو ثابت نہیں کرنا چاہتے تھے.

---

[1] گزشتہ حوالہ، صفحہ نمبر ١٥٢
[2] یہ مطلب گزشتہ کتاب کے صفحہ ص ١٥٢ میں اسی حدیث کے ذیل میں مذکور ہے
[3] صحیح بخاری جز اول ص ١١٠ کتاب الصلوۃ باب تاخیر الظہر الی العصر طبع مصر نسخہ امیریہ ١٣١٤ ھ.
[4] گزشتہ حوالہ.
[5] صحیح بخاری جز اول کتاب الصلوۃ باب ذکر العشاء ص ١١٣ طبع مصر ١٣١٤ ھ.

۱۵۔ مسلم بن حجاج نے اپنی کتاب صحیح میں بیان کیا ہے: قال رجل لابن عباس الصلاۃ فسکت ثم قال الصلاۃ فسکت ثم قال الصلاۃ فسکت ثم قال: لا أم لک أتعلمنا بالصلوٰۃ و کنا نجمع بین الصلاتین علیٰ عھد رسول اللہ [ص][1] ایک شخص نے ابن عباس سے کہا : ''نماز'' تو ابن عباس نے کچھ نہ کہا اس شخص نے پھر کہا ''نماز'' پھر بھی ابن عباس نے اسے کوئی جواب نہ دیا تو اس شخص نے پھر کہا ''نماز'' لیکن ابن عباس نے پھر کوئی جواب نہیں دیا جب اس شخص نے چوتھی مرتبہ کہا: ''نماز'' تب ابن عباس بولے او بے اصل! تم ہمیں نماز کی تعلیم دینا چاہتے ہو؟ جبکہ ہم پیغمبر خداؐ کے زمانے میں دو نمازوں کو ایک ساتھ بجالایا کرتے تھے.

۱۶۔ مسلم نے یوں روایت نقل کی ہے: اِن رسول اللہ [ص] جمع بین الصلاۃ في سفرۃ سافرھا في غزوۃ تبوک فجمع بین الظھر والعصر والمغرب والعشاء. قال سعید فقلت: لابن عباس: ما حملہ علی ذلک ؟ قال أراد أن لا یحرج أمتہ[2] پیغمبر خداؐ نے غزوہ تبوک کے سفر میں نمازوں کو جمع کر کے نماز ظہر و عصر اور مغرب عشاء کو ایک ساتھ پڑھا تھا سعید بن جبیر نے کہا کہ میں نے ابن عباس سے آنحضرتؐ کے اس عمل کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا آنحضرت چاہتے تھے کہ ان کی امت مشقت میں نہ پڑے.

۱۷۔ مسلم ابن حجاج نے معاذ سے اس طرح نقل کیا ہے: خرجنا مع رسول اللہ [ص] في غزوۃ تبوک فکان یُصلّي الظھر والعصر جمیعًا والمغرب و العشاء جمیعًا[3]. ہم پیغمبر خداؐ کے ساتھ غزوہ تبوک کی طرف نکلے تو آنحضرتؐ نے نماز ظہر و عصر اور نماز مغرب وعشاء کو ایک ساتھ پڑھا

۱۸۔ مالک ابن انس کا اپنی کتاب ''الموطأ'' میں بیان ہے کہ: عن ابن شھاب أنّہ سأل سالم بن عبداللہ : ھل یجمع بین الظھر والعصر في السفر؟ فقال نعم لا بأس بذلک، ألم تر الیٰ الصلاۃ الناس بعرفۃ[4]؟ ابن شہاب نے سالم بن عبد اللہ سے سوال کیا کہ کیا حالت سفر میں نماز ظہر و عصر کو ایک ساتھ بجالایا جاسکتا تھا ؟ سالم بن عبداللہ نے جواب دیا ہاں اس کام میں کوئی حرج نہیں ہے کیا تم نے عرفہ کے دن لوگوں کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا ہے؟ یہاں پر اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ عرفہ کے دن نماز ظہر و عصر کو نماز ظہر کے وقت میں

---

[1] صحیح مسلم جز ۲ ص ۱۵۳ باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر
[2] صحیح مسلم جز ۲ ص ۱۵۱ طبع مصر
[3] گزشتہ حوالہ
[4] موطأ مالک ص ۱۲۵ حدیث ۱۸۰ طبع ۳ ،بیروت.

بجالانے کو سب مسلمان جائز سمجھتے ہیں اس مقام پر سالم بن عبد اللہ نے کہا تھا کہ جیسے لوگ عرفہ کے دن دو نمازوں کو اکھٹا پڑھتے ہیں اسی طرح عام دنوں میں بھی دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔

۱۹۔متقی ہندی اپنی کتاب ''کنزالعمال'' میں لکھتے ہیں: قال عبداللہ: جمع لنا رسول اللہ [ص] مقیما غیر مسافر بین الظہر والعصر والمغرب والعشاء فقال رجل لابن عمر: لم تری النبیّ [ص] فعل ذلک؟ قال: لِأن لایحرج أمتہ ان جمع رجل![1] عبد اللہ ابن عمر نے کہا: کہ پیغمبر خداؐ نے بغیر سفر کے نماز ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کو اکھٹا پڑھا تھا ایک شخص نے ابن عمر سے سوال کیا کہ پیغمبر اکرمؐ نے ایسا کیوں کیا؟ تو ابن عمر نے جواب دیا کہ آنحضرتؐ اپنی امت کو مشقت میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے تاکہ اگر کوئی شخص چاہے تو دو نمازوں کو ایک ساتھ بجالائے۔

۲۰۔اسی طرح کنزالعمال میں یہ روایت بھی موجود ہے: عن جابر أن النبیّ [ص] جمع بین الظہر والعصر بأذان و اِقامتین[2] نبی اکرمؐ نے ظہر و عصر کی نمازوں کو اکھٹا ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ پڑھا تھا۔

۲۱۔ کنزالعمال میں درج ذیل روایت بھی موجود ہے: عن جابر أن رسول اللہ [ص] غربت لہ الشمس بمکۃ فجمع بینھما بسرف[3] جابر بن عبداللہ سے منقول ہے کہ مکہ میں ایک دفعہ جب آفتاب غروب ہوگیا تو رسول خداؐ نے ''سرف[4]'' کے مقام پر نماز مغرب و عشاء کو اکھٹا پڑھا تھا۔

۲۲۔کنزالعمال میں ابن عباس سے یوں منقول ہے: جمع رسول اللہ [ص] بین الظہر والعصر والمغرب والعشاء بالمدینۃ في غیر سفر ولا مطر قال: قلت لابن عباس: لم تراہ فعل ذلک؟ قال: أراد التوسعۃ علیٰ أمتہ[5] پیغمبر خداؐ نے مدینہ میں بغیر سفر اور بارش کے نماز ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کو اکھٹا پڑھا تھا۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے ابن عباس سے پوچھا آنحضرتؐ کے اس عمل کے سلسلے میں آپ کا کیا

---

[1] کنزالعمال کتاب الصلوۃ ،باب الرابع فی صلاۃ المسافر باب جمع جلد ۸ ص ۲۴۶ طبع ۱حلب ۱۳۹۱ ہ.
[2] کنزالعمال کتاب الصلوۃ ، باب الرابع فی صلوۃ المسافر باب جمع جلد۸ ص ۲۴۷ طبع ۱ حلب.
[3] گزشتہ حوالہ.
[4] سرف مکہ سے نومیل کے فاصلے پر واقع مقام کا نام ہے (یہ بات کنزالعمال سے اسی حدیث کے ذیل سے ماخوذ ہے)
[5] کنزالعمال ،کتاب الصلوۃ ، الباب الرابع ، باب جمع جلد ۸.

نظریہ ہے؟ تو ابن عباس نے جواب دیا آنحضرتؐ اپنی امت کے لئے سہولت اور آسانی قرار دینا چاہتے تھے . نتیجہ:اب ہم گزشتہ روایات کی روشنی میں دو نمازوں کو جمع کرنے کے سلسلے میں شیعوں کے نظریہ کے صحیح ہونے پر چند دلیلیں پیش کریں گے:۱۔ دونمازوں کو ایک وقت میں ایک ساتھ بجالانے کی اجازت نمازیوں کی سہولت اور انہیں مشقت سے بچانے کے لئے دی گئی ہے.متعدد روایات میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اگر نماز ظہر و عصر یا مغرب و عشاء کو ایک وقت میں بجالانا جائز نہ ہوتا تو یہ امر مسلمانوں کے لئے زحمت و مشقت کا باعث بنتا اسی وجہ سے پیغمبر اسلامؐ نے مسلمانوں کی سہولت اور آسانی کے لئے دو نمازوں کو ایک وقت میں بجالانے کو جائز قرار دیا ہے (اس سلسلے میں دسویں ، سولھویں ، انیسویں ، اور بائیسویں حدیث کا مطالعہ فرمائیے) واضح ہے کہ اگر ان روایات سے یہ مراد ہو کہ نماز ظہر کو اسکے آخری وقت(جب ہر چیز کا سایہ اسکے برابر ہوجائے)تک تاخیر کر کے پڑھا جائے اور نماز عصر کو اسکے اول وقت میں بجالایا جائے اس طرح ہر دو نمازیں ایک ساتھ مگر اپنے اوقات ہی میں پڑھی جائیں(اہل سنت حضرات ان روایات سے یہی مراد لیتے ہیں) تو ایسے کام میں کسی طرح کی سہولت نہیں ہوگی بلکہ یہ کام مزید مشقت کا باعث بنے گا جبکہ دو نمازوں کو ایک ساتھ بجالانے کی اجازت کا یہ مقصد تھا کہ نمازیوں کیلئے سہولت ہو۔

اس بیان سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ گزشتہ روایات سے مراد یہ ہے کہ دو نمازوں کو ان کے مشترک وقت کے ہر حصے میں بجالایا جاسکتا ہے اب نماز گزار کو اختیار ہے کہ وہ مشترک وقت کے ابتدائی حصے میں نماز پڑھے یا اس کے آخری حصے میں اور ان روایات سے یہ مراد نہیں ہے کہ ایک نماز کو اس کے آخری وقت میں اور دوسری کو اس کے اول وقت میں ادا کیا جائے.

۲۔روز عرفہ دونمازوں کو اکھٹا پڑھنے کے حکم سے باقی دنوں میں نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنے کا جواز معلوم ہوتا ہے تمام اسلامی فرقوں کے نزدیک عرفہ کے دن ظہر و عصر کی نمازوں کو ایک وقت میں بجالانا جائز ہے [1]مزید براں گزشتہ روایات میں سے بعض اس بات کی گواہ ہیں کہ میدان عرفات کی طرح باقی مقامات پر بھی نمازوں کو اکھٹا بجالایا جاسکتا ہے اب اس اعتبار سے روز عرفہ اور باقی عام دنوں

[1] الفقہ علی المذاھب الاربعہ ، کتاب الصلوۃ ،الجمع بین الصلوٰتین تقدیما و تاخیرا.

کے درمیان یا عرفات کی سرزمین اور باقی عام جگہوں میں کوئی فرق نہیں ہے اس سلسلہ میں اٹھارویں حدیث کا مطالعہ فرمائیں.
لہذا جس طرح مسلمانوں کے متفقہ نظرئیے کے مطابق عرفہ میں ظہر و عصر کی نمازوں کو ظہر کے وقت پر ایک ساتھ پڑھا جاتا ہے اسی طرح عرفہ کے علاوہ بھی ان نمازوں کو ظہر کے وقت اکھٹا پڑھنا بالکل صحیح ہے.

۳۔ سفر کی حالت میں دو نمازوں کو اکھٹا پڑھنے کے حکم سے غیر سفر میں بھی نمازوں کے ایک ساتھ بجالانے کا جواز معلوم ہوتا ہے .ایک طرف سے حنبلی، مالکی، اور شافعی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حالت سفر میں دو نمازوں کو اکھٹا بجالایا جاسکتا ہے اور دوسری طرف گزشتہ روایات صراحت کے ساتھ کہہ رہی ہیں کہ اس اعتبار سے سفر اور غیر سفر میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ پیغمبر اکرمؐ نے دونوں حالتوں میں نمازوں کو اکھٹا پڑھا تھا.(اس سلسلے میں تیسری، گیارہویں، تیرہویں، اور بائیسویں حدیث کا مطالعہ فرمائیں) اس بنیاد پر (شیعوں کے نظرئیے کے مطابق) جس طرح حالت سفر میں دو نمازوں کو اکھٹا بجالانا صحیح ہے اسی طرح عام حالات میں بھی دو نمازوں کو اکھٹا پڑھا جاسکتا ہے.

۴۔اضطراری حالت میں دو نمازوں کے اکھٹا پڑھنے کے حکم سے عام حالت میں بھی نمازوں کے اکھٹا پڑھنے کا جواز معلوم ہوجاتا ہے,اہل سنت کی صحیح اور مسند کتابوں میں سے بہت سی روایات اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اور ان کے اصحاب نے چند اضطراری موقعوں پر جیسے بارش کے وقت یا دشمن کے خوف سے یا بیماری کی حالت میں نمازوں کو ایک ساتھ اور ایک ہی وقت میں (ٹھیک اسی طرح جیسے شیعہ کہتے ہیں) پڑھا تھا اور اسی وجہ سے مختلف اسلامی فرقوں کے فقہاء نے بعض اضطراری حالات میں دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنا جائز قرار دیا ہے جب کہ گزشتہ روایات اس بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کررہی ہیں کہ اس سلسلے میں اضطراری اور عام حالت میں کوئی فرق نہیں ہے. اور پیغمبر اکرمؐ نے دونوں حالتوں میں اپنی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھا ہے.اس سلسلے میں تیسری، گیارہویں، اور بارہویں، اور بائیسویں روایت کا مطالعہ کیجئے

۵۔اصحاب پیغمبرؐ کی روش سے دو نمازوں کے ایک ساتھ بجالانے کا جواز معلوم ہوتا ہے.گزشتہ روایات میں یہ نکتہ موجود ہے کہ آنحضرتؐ کے بہت سے اصحاب دو نمازوں کو ایک وقت میں بجالاتے تھے جیسے کہ عبداللہ ابن عباس نے نماز مغرب میں اتنی دیر کردی تھی کہ اندھیرا چھا گیا تھا اور آسمان پر ستارے چمکنے لگے تھے اور لوگوں نے نماز کی صدائیں دینا شروع کردی تھیں مگر ابن عباس نے ان کی طرف توجہ نہیں کی تھی سرانجام جب رات کا کچھ حصہ گزر گیا تب انہوں نے نماز مغرب و عشاء پڑھی تھی,اور اعتراض کرنے والوں کو یہ جواب دیا تھا : میں نے پیغمبر اسلامؐ کو اسی طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے نیز ابوہریرہ نے بھی ابن عباس کی اس بات کی تائید کی تھی (اس سلسلے میں دوسری، ساتویں، نویں، اور پندرہویں روایت کا مطالعہ فرمائیں)گزشتہ روایات کی روشنی میں اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ پیغمبر اسلامؐ کے صحابی ابن عباس نے شیعوں کی طرح دو نمازوں کو ایک وقت میں پڑھا تھا

٦۔پیغمبر اسلامؐ کی سیرت سے دو نمازوں کو ایک ساتھ بجالانے کا جواز معلوم ہوتا ہے.اکیسویں حدیث کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ نماز مغرب کے وقت پیغمبر اکرمؐ مکہ مکرمہ میں تشریف فرما تھے لیکن آنحضرتؐ نے نماز مغرب میں تاخیر کی تھی اور ''سرف'' نامی علاقہ(جو مکہ سے نو میل کے فاصلے پر واقع تھا)میں پہنچ کر نماز مغرب و عشاء کو ایک ساتھ پڑھا تھا جب کہ یہ واضح ہے کہ اگر آنحضرت مکہ سے مغرب کے اول وقت میں چلے ہوں گے تو اس زمانے کی کم رفتار سواری کے ذریعے سفر کرنے کی وجہ سے یقیناًرات کا کافی حصہ گزر جانے کے بعد ہی سرف کے مقام تک پہنچے ہوں گے اسی وجہ سے حضورؐ نے مغرب و عشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھا تھا اہل سنت حضرات کی صحیح اور مسند کتابوں سے منقول گزشتہ روایات شیعوں کے نظریئے(ظہر و عصر یا مغرب و عشاء کی نمازوں کو ہر وقت، ہر جگہ اور ہر طرح کی صورتحال میں ایک ساتھ پڑھنا جائز ہے)کے صحیح ہونے کی گواہی دیتی ہیں.

اٹھائیسواں سوال

شیعوں کی فقہ کے ماخذ کون سے ہیں؟

جواب:شیعہ ،قرآن مجید اور سنت نبوی کی پیروی کرتے ہوئے احکام شرعی کو درج ذیل چاربنیادی مآخذ سے حاصل کرتے ہیں:

ا۔کتاب خدا ۲۔سنت۳۔اجماع۴۔عقل

مذکورہ ماخذو منابع میں سے قرآن مجید اور سنت نبویؐ فقہ شیعہ کے بنیادی ترین ماخذ ہیں اب ہم یہاں ان دونوں کے سلسلے میں اختصار کیساتھ گفتگو کریں گے: کتاب خدا ؛ قرآن مجید مکتب تشیع کے پیرو قرآن مجید کو اپنی فقہ کا محکم ترین منبع اور احکام الہی،کی شناخت کا معیار سمجھتے ہیں کیونکہ شیعوں کے ائمہ [ع]نے فقہی احکام کے حصول کے لئے قرآن مجید کو ایک محکم مرجع قرار دیا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ کسی بھی نظرئیے کو قبول کرنے سے پہلے اسے قرآن مجید پر پرکھا جائے اگر وہ نظریہ قرآن سے مطابقت رکھتا ہو تو اسے قبول کرلیا جائے ورنہ اس نظرئیے کو نہ مانا جائے.

اس سلسلے میں امام صادق ۔فرماتے ہیں:وکل حدیث لایوافق کتاب اللہ فھو زخرف! ہر وہ کلام جو کتاب خدا سے مطابقت نہ رکھتا ہو وہ باطل ہے.اسی طرح امام صادق ۔نے رسول خداؐ سے یوں نقل کیا ہے:أیّھا الناس ماجائکم عني یوافق کتاب اللہ فأنا قلتہ وماجاءکم یخالف کتاب اللہ فلم أقلہ[۲])اے لوگو! ہر وہ کلام جو میری طرف سے تم تک پہنچے اگر وہ کتاب خدا کے مطابق ہو تو وہ میرا قول ہے لیکن اگر تم تک پہنچنے والا کلام کتاب خدا کا مخالف ہو تو وہ میرا قول نہیں ہے.

ان دو حدیثوں سے بخوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ شیعوں کے ائمہ [ع]کی نگاہ میں احکام شرعی کو حاصل کرنے کے لئے کتاب خدا محکم ترین ماخذ شمار ہوتی ہے.

---

[۱] اصول کافی، جلد۱ ، کتاب فضل العلم ، باب الاخذ بالسنۃ و شواہد الکتاب ، حدیث ۳.
[۲] گذشتہ حوالہ حدیث ۵.

سنت: حضرت رسول اکرم [ص] کا قول و فعل اور کسی کام کے سلسلے میں آنحضرتؐ کی تائید کو سنت کہتے ہیں اسے شیعوں کی فقہ کا دوسرا ماخذ شمار کیا جاتا ہے سنت نبویؐ کو نقل کرنے والے ائمہ معصومین [ع] ہیں جو آنحضرتؐ کے علوم کے خزینہ دار ہیں. البتہ نبی اکرمؐ کے چند دوسرے طریقوں سے نقل ہونے والے ارشادات کو بھی شیعہ قبول کرتے ہیں یہاں پر ضروری ہے کہ ہم دو چیزوں کے متعلق بحث کریں: سنت نبویؐ سے تمسک کی دلیلیں: شیعوں کے ائمہ [ع] نے اپنی پیروی کرنے والوں کو جس طرح قرآن مجید پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے اسی طرح انہوں نے سنت نبوی کی پیروی کرنے کی بھی تاکید کی ہے اور ہمیشہ اپنے ارشادات میں ان دونوں سے تمسک اختیار کرنے کا حکم دیا ہے. امام صادق ـ فرماتے ہیں: اِذا ورد علیکم حدیث فوجدتم لہ شاھدًا من کتاب اللّٰہ أو من قول رسول [ص] واِلا فالذي جائکم بہ أولیٰ بہ[1].

جب کوئی کلام تم تک پہنچے تو اگر تمہیں کتاب خدا یا سنت نبویؐ سے اس کی تائید حاصل ہوجائے تو اسے قبول کرلینا ور نہ وہ کلام بیان کرنے والے ہی کو مبارک ہو. اسی طرح امام محمد باقر ـ نے ایک جامع الشرائط فقیہ کے لئے سنت نبی اکرم سے تمسک کو اہم ترین شرط قرار دیتے ہوئے یوں فرمایا ہے: اِن الفقیہ حق الفقیہ الزاھد في الدنیا والراغب في الآخرۃ المتمسک بسنۃ النبي[2] ص بے شک حقیقی فقیہ وہ ہے جو دنیا سے رغبت نہ رکھتا ہو اور آخرت کا اشتیاق رکھتا ہو، نیز سنت نبوی سے تمسک رکھنے والا ہو. ائمہ معصومین [ع] نے اس حد تک سنت نبویؐ کی تاکید فرمائی ہے کہ وہ کتاب خدا اور سنت نبوی کی مخالفت کو کفر کی اساس قرار دیتے ہیں اس سلسلے میں امام صادق ـ یوں فرماتے ہیں: مَن خالف کتاب اللّٰہ وسنۃ محمد [ص] فقد کفر[3]. جس شخص نے کتاب خدا اور سنت محمدی کی مخالفت کی وہ کافر ہوگیا. اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ شیعہ مسلمانوں کے بقیہ فرقوں کی بہ نسبت نبی اکرمؐ کی سنت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اسی طرح بعض لوگوں کا یہ نظریہ بھی باطل ہوجاتا ہے کہ شیعہ نبی اکرمؐ کی سنت سے بیگانہ اور دور ہیں.

[1] اصول کافی جلد۱ کتاب فضل العلم ، باب الاخذ بالسنہ و شواھد الکتاب حدیث ۲.
[2] گذشتہ حوالہ حدیث ۸
[3] گذشتہ حوالہ حدیث ۶

احادیث اہل بیت [ع] سے تمسک کے دلائل عترت پیغمبرکی احادیث کے سلسلے میں شیعوں کے نظریہ کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ ہم ذیل کے دو موضوعات پر گفتگو کریں: الف: ائمہ معصومین کی احادیث کی حقیقت.

ب:اہل بیت رسولؐ سے تمسک کے اہم اور ضروری ہونے کے دلائل. اب ہم یہاں ان دو موضوعات کے سلسلے میں مختصر طور پر تحقیقی گفتگو کریں گے: عترت رسولؐ کی احادیث کی حقیقت شیعوں کے نکتہ نظر سے فقط خداوند حکیم ہی انسانوں کے لئے شریعت قرار دینے اور قانون وضع کرنے کا حق رکھتا ہے اور اس کی طرف سے یہ شریعت اور قوانین پیغمبر اکرمؐ کے ذریعہ لوگوں تک پہنچتے ہیں. واضح ہے کہ نبی اکرمؐ خدا اور انسانوں کے درمیان وحی کے ذریعہ حاصل ہونے والی شریعت کے پہنچانے کے لئے واسطے کی ذمہ داری کو نبھاتے ہیں اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے اگر شیعہ اہل بیت [ع] کی احادیث کو اپنی فقہ کے ماخذ میں شمار کرتے ہیں تو ہرگز اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل بیت [ع] کی احادیث سنت نبویؐ کے مقابلے میں کوئی مستقل حیثیت رکھتی ہیں بلکہ احادیث اہل بیت [ع] اس وجہ سے معتبر ہیں کہ وہ سنت نبویؐ کو بیان کرتی ہیں۔

اس اعتبار سے ائمہ معصومین [ع] کبھی بھی اپنی طرف سے کوئی بات نہیں فرماتے بلکہ جو کچھ وہ فرماتے ہیں وہ در حقیقت سنت پیغمبرؐ ہی کی وضاحت ہوتی ہے یہاں پر ہم اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ائمہ معصومین [ع] کی چند روایات پیش کریں گے: ۱۔امام صادق ـ نے ایک شخص کے سوال کے جواب میں یوں فرمایا ہے: مھما أجبتک فیہ بشيء فھو عن رسول اللہ [ص] لسنا نقول برأینا من شيء[1]. اس سلسلے میں جو جواب میں نے تمہیں دیا ہے وہ رسول خداؐ کی طرف سے ہے ہم کبھی بھی اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے :اور ایک مقام پر یوں فرماتے ہیں: حدیثي حدیث أبي، و حدیث أبي حدیث جدي و حدیث جدي حدیث الحسین وحدیث الحسین حدیث الحسن و حدیث الحسن حدیث أمیر المؤمنین، و حدیث أمیر المؤمنین حدیث رسول اللہ [ص] و حدیث رسول اللہ قول اللہ عزّ وجلّ[2]. میری حدیث میرے والد (امام باقر ـ) کی حدیث ہے ،اور میرے والد کی حدیث میرے دادا (امام زین العابدین ـ) کی

[1] جامع الاحادیث الشیعہ جلد١ ص ١٢٩
[2] گذشتہ حوالہ ص ١٢٧

حدیث ہے اور میرے دادا کی حدیث امام حسین ـ کی حدیث ہے اور امام حسین ـ کی حدیث امام حسن ـ کی حدیث ہے اور امام حسن ـ کی حدیث امیر المومنین ـ کی حدیث ہے اور امیر المومنین ـ کی حدیث رسول خدا [ص]کی حدیث ہے اور رسول خدا [ص]کی حدیث خداوند متعال کا قول ہے.

۲ـ امام محمد باقر ـ نے جابر سے یوں فرمایا تھا: حدثني أبي عن جدي رسول اللّٰہ [ص]عن جبرائیل ـ عن اللّٰہ عزّوجلّ و کلما أحدّثک بھذا الأسناد! میرے پدربزرگوار نے میرے دادا رسول خدا [ص]سے اور انہوں نے جبرئیل سے اور انہوں نے خداوندعالم سے روایت کی ہے اور جو کچھ میں تمہارے لئے بیان کرتا ہوں ان سب کا سلسلہ سند یہی ہوتا ہے.اہل بیتؑ پیغمبرؐ سے تمسک کے اہم اور ضروری ہونے کے دلائل شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کے محدثین اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول خداؐ نے بھی میراث کے طور پر اپنی امت کے لئے دو قیمتی چیزیں چھوڑی ہیں اور تمام مسلمانوں کو ان کی پیروی کا حکم دیا ہے ان میں سے ایک کتاب خدا ہے اور دوسرے آنحضرتؐ کے اہل بیت میں یہاں ہم نمونے کے طور پر ان روایات میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں: ۱ـ ترمذی نے اپنی کتاب صحیح میں جابر بن عبداللّٰہ انصاری سے اور انہوں نے نبی اکرمؐ سے روایت کی ہے: یاأیّھا النّاس إنّي قد ترکت فیکم ما إن أخذتم بہ لن تضلّوا : کتاب اللّٰہ و عترتي أہل بیتي[۲].اے لوگو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں اگر تم ان سے متمسک رہے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے اور وہ کتاب خدا اور میری عترتؑ ہیں.

۲ـ اسی طرح ترمذی نے اپنی کتاب صحیح میں یہ حدیث نقل کی ہے: قال رسول اللّٰہ [ص]إنّي تارک فیکم ما إن تمسکتم بہ لن تضلّوا بعدي أحدھما أعظم من الآخر : کتاب اللّٰہ حبل ممدود من السماء إلیٰ الأرض و عترتي أھل بیتي ولن یفترقا حتیٰ یردا عليّ الحوض فانظروا کیف تخلفوني فیھما[۳]. میں تمہارے درمیان دوگرانقدر چیزیں چھوڑے جارہا ہوں جب تک تم ان سے متمسک رہوگے ہرگز گمراہ نہ ہوگے. ان دو چیزوں میں سے ایک دوسری سے بڑی ہے، کتاب خدا ایک ایسی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک آویزاں ہے اور

---

[۱] گذشتہ حوالہ ص۱۲۸

[۲] صحیح ترمذی ، کتاب المناقب ، باب مناقب اہل بیت النبی جلد۵ ص ۶۶۲ حدیث ۳۷۸۶ طبع بیروت.

[۳] گذشتہ حوالہ ص ۶۶۳ حدیث ۳۷۸۸.

دوسرے میرے اہل بیت ہیں اور یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں لہذا یہ دیکھنا کہ تم میرے بعد ان کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرتے ہو.

۳۔ مسلم بن حجاج نے اپنی کتاب صحیح میں پیغمبر اکرمؐ سے یہ روایت نقل کی ہے:ألا أيّها النّاس فإنّما أنا بشر يوشك أن يأتي رسول ربّي فأجيب و أنا تارك فيكم ثقلين أولها كتاب اللّٰہ فيه الهدىٰ والنور فخذوا بكتاب اللّٰہ وا ستمسكوا به فحثّ علىٰ كتاب اللّٰہ و رغّب فيه ثم قال : أهل بيتي أذكركم اللّٰہ في أهل بيتي أذكركم اللّٰہ في أهل بيتي أذكركم اللّٰہ في أهل بيتي[1]اے لوگو!بے شک میں ایک بشر ہوں اور قریب ہے کہ میرے پروردگار کا بھیجا ہوا نمائندہ آئے اور میں اسکی دعوت قبول کروں اور میں تمہارے درمیان دو وزنی چیزیں چھوڑے جارہاہوں ایک کتاب خدا ہے جس میں ہدایت اور نور ہے کتاب خدا کو لے لو اور اسے تھامے رکھو اور پھر پیغمبر اسلامؐ نے کتاب خدا پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی اور اس کی جانب رغبت دلائی اور اس کے بعد یوں فرمایا اور دوسرے میرے اہل بیت ہیں اور میں تمہیں اپنے اہل بیت کے سلسلے میں وصیت و تاکید کرتا ہوں اور اس جملے کو تین مرتبہ دہرایا.

۴۔بعض محدثین نے پیغمبر اسلامؐ سے یہ روایت نقل کی ہے:إنّي تارك فيكم الثقلين كتاب اللّٰہ و أهل بيتي و إنّهما لن يفترقا حتىٰ يردا عليّ الحوض[2] بے شک! میں تمہارے درمیان دووزنی چیزیں چھوڑے جارہا ہوں ایک کتاب خدا اور دوسرے میرے اہل بیت ہیں اور یہ دونوں ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں.یہاں پر اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ اس سلسلے میں اتنی زیادہ حدیثیں موجود ہیں کہ ان سب کا اس مختصر کتاب میں ذکر کرنا ممکن نہیں ہے.علامہ میر حامد حسینؒ نے اس روایت کے سلسلۂ سند کو اپنی چھ جلدوں والی کتاب (عبقات الانوار) میں جمع کر کے پیش کیا ہے.گذشتہ احادیث کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ کتاب خدا اور سنت نبویؐ کے ساتھ ساتھ آنحضرتؐ کے اہل بیتؑ سے تمسک اور ان کی پیروی بھی اسلام کے ضروریات میں سے ہے.اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عترت پیغمبر [ص]سے مراد کون افراد ہیں کہ جن کی پیروی کو نبی اکرمؐ نے سب مسلمانوں پر

[1] صحیح مسلم جز ۷ فضائل علی ابن ابی طالب ص ۱۲۲ اور ۱۲۳.
[2] مستدرک حاکم جز ۳ ص ۱۴۸ ، الصواعق المحرقہ باب ۱۱ فصل اول ص ۱۴۹ اس مضمون کے قریب بعض درج ذیل کتابوں میں بھی روایات موجود ہیں.مسنداحمد جز ۵ ص۱۸۲اور ۱۸۳.کنز العمال ،جز اول باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ص ۴۴.

واجب قرار دیا ہے ؟اس مسئلے کی وضاحت کے لئے ہم احادیث کی روشنی میں عترت نبیؐ کے سلسلے میں تحقیق پیش کرنا چاہیں گے:

اہل بیتؑ پیغمبر [ص]کون ہیں؟گذشتہ روایات سے واضح ہوجاتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے سب مسلمانوں کو اپنی عترت کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور کتاب خدا کی طرح انہیں بھی لوگوں کا مرجع قرار دیا ہے اور صاف لفظوں میں فرمایا ہے کہ ''قرآن اور عترت ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے'' اس بنیاد پر اہل بیت پیغمبرؐ وہ ہیں کہ جنہیں آپؐ نے قرآن مجید کا ہم پلہ قرار دیا ہے اور جو معصوم ہونے کے ساتھ ساتھ معارف اسلامی سے مکمل طور پر آگاہی رکھتے ہیں.کیونکہ اگر وہ ان صفات کے مالک نہ ہوں تو قرآن مجید سے جدا ہو جائیں گے جبکہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا ہے کہ : قرآن اور عترت ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے ملاقات کریں.

اس طرح یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اہل بیت [ع]اور ان کی اعلی صفات کی صحیح طور پر شناخت ایک ضروری امر ہے اب ہم اس سلسلے میں مسلمانوں کے درمیان بزرگ سمجھنے جانے والے محدثین سے منقول روایات کی روشنی میں چند واضح دلیلیں پیش کریں گے: ۱۔ مسلم بن حجاج نے حدیث ثقلین کا ذکر کرنے کے بعد یوں کہا ہے کہ '' :یزید بن حیان نے زید بن ارقم سے پوچھا اہل بیت پیغمبرؐ کون ہیں ؟کیا وہ پیغمبراکرمؐ کی بیویاں ہیں؟'' زید بن ارقم نے جواب دیا : لا و أیم اللّٰہ اِن المرأۃ تکون مع الرجل العصر من الدھر ثم یطلّقھا فترجع اِلیٰ أبیھا و قومھا أھل بیتہ أصلہ و عصبتہ الذین حرموا الصدقۃ بعدہ! نہیں خدا کی قسم عورت جب ایک مدت تک کسی مرد کے ساتھ رہتی ہے اور پھر وہ مرد اسے طلاق دے دیتاہے تو وہ عورت اپنے باپ اور رشتے داروں کے پاس واپس چلی جاتی ہے اہل بیت پیغمبرؐ سے مراد وہ افراد ہیں جو پیغمبراکرمؐ کے اصلی اور قریبی رشتہ دار ہیں کہ جن پر آنحضرتؐ کے بعد صدقہ حرام ہے.یہ قول بخوبی اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ وہ عترت پیغمبرؐ جن سے تمسک قرآن کی پیروی کی طرح واجب ہے ان سے ہرگز آنحضرتؐ کی بیویاں

[1] صحیح مسلم جز ۷ باب فضائل علی بن ابی طالب ۔ ،ص ۱۳۲طبع مصر.

مراد نہیں ہیں بلکہ اہل بیت پیغمبرؐ سے وہ افراد مراد ہیں جو آنحضرتؐ سے جسمانی اور معنوی رشتہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر چند خاص صلاحتیں بھی پائی جاتی ہوں.تبھی تو وہ قرآن مجید کی طرح مسلمانوں کا مرجع قرار پا سکتے ہیں.

۲۔پیغمبر اکرمؐ نے صرف اہل بیت [ع]کے اوصاف بیان کرنے پر ہی اکتفاء نہیں کی تھی بلکہ حضور اکرمؐ نے ان کی تعداد (جو کہ بارہ ہے)کو بھی صاف لفظوں میں بیان کردیا تھا : مسلم نے جابر بن سمرہ سے نقل کیا ہے:سمعت رسول اللہ [ص]یقول: لایزال الاِسلام عزیزًا اِلیٰ اثني عشر خلیفۃ ثم قال کلمۃ لم أفھمھا فقلت لأبي ماقال ؟ فقال: کلھم من قریش[1]یں نے پیغمبر خدا [ص]کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اسلام کو بارہ خلفاء کے ذریعہ عزت حاصل ہوگی اور پھر پیغمبر اکرمؐ نے کوئی لفظ کہا جسے میں نہیں سمجھ سکا لہذا میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ پیغمبر اکرمؐ نے کیا فرمایا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ وہ سب خلفاء قریش میں سے ہوں گے.

مسلم بن حجاج نے اسی طرح رسول خداؐ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے: لایزال أمر الناس ماضیا ماولیھم اثنا عشر رجلاً[2]لوگوں کے امور اس وقت تک بہترین انداز میں گزریں گے جب تک ان کے بارہ والی رہیں گے.یہ دو روایتیں شیعوں کے اس عقیدے کی واضح گواہ ہیں ''کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد عالم اسلام کے بارہ امام ہی لوگوں کے حقیقی پیشوا ہیں'' کیونکہ اسلام میں ایسے بارہ خلفاء جو پیغمبر اسلامؐ کے بعد بلافاصلہ مسلمانوں کے مرجع اور عزت اسلام کا سبب بنے ہوں ، اہل بیتؑ کے بارہ اماموں کے علاوہ نہیں ملتے کیونکہ اگر اہل سنت کے درمیان خلفاء راشدین کہے جانے والے چار خلفاء سے صرف نظر کرلیا جائے پھر بھی بنی امیہ اور بنی عباس کے حکمرانوں کی تاریخ اس بات کی بخوبی گواہی دیتی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے برے کردار کی وجہ سے اسلام اور مسلمین کی رسوائی کا سبب بنتے رہے ہیں اس اعتبار سے وہ (اہل بیتؑ)کہ جنہیں پیغمبر اسلامؐ نے قرآن مجید کا ہم پلہ اور مسلمانوں کا مرجع قرار دیا ہے وہ عترت نبیؐ کے وہی بارہ امام ہیں جو سنت نبیؐ کے محافظ اور آنحضرتؐ کے علوم کے خزینہ دار رہے ہیں.

---

[1] صحیح مسلم جلد ۶ ص۳ طبع مصر.
[2] گذشتہ حوالہ.

۳۔حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب۔ کی نگاہ میں بھی مسلمانوں کے ائمہ کو بنی ہاشم سے ہونا چاہیے یہ بات شیعوں کے اس نظرئیے (کہ اہل بیتؑ کی شناخت حاصل کرنا ضروری ہے) پر ایک اور واضح دلیل ہے . حضرت امام علی ۔ فرماتے ہیں: اِن الأئمة من قریش غرسوا في ھذا البطن من بني ہاشم لا تصلح علیٰ مَن سواھم ولا تصلح الولاة من غیرھم[1]۔یاد رکھو قریش کے سارے امام جناب ہاشم کی اسی کشت زار میں قرار دئیے گئے ہیں اور یہ امامت نہ ان کے علاوہ کسی کو زیب دیتی ہے اور نہ ان سے باہر کوئی اس کا اہل ہوسکتا ہے.

نتیجہ:گزشتہ روایات کی روشنی میں دو حقیقتیں آشکار ہوجاتی ہیں:ا۔قرآن مجید کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اہل بیت[ع]سے تمسک اور ان کی پیروی بھی واجب ہے.

۲۔پیغمبر اسلامؐ کے اہل بیت جو قرآن مجید کے ہم پلہ اور مسلمانوں کے مرجع ہیں مندرجہ ذیل خصوصیات کے مالک ہیں:الف:وہ سب قبیلۂ قریش اور بنی ہاشم کے خاندان میں سے ہیں.

ب:وہ سب پیغمبر اکرمؐ کے ایسے رشتہ دار ہیں جن پر صدقہ حرام ہے.

ج:وہ سب عصمت کے درجے پر فائز ہیں ورنہ وہ عملی طور پر کتاب خدا سے جدا ہوجائیں گے جبکہ پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ یہ دونوں(قرآن و عترتؑ) ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں گے.

د:ان کی تعداد بارہ ہے جو یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے امام ہوں گے.

ھ:پیغمبر اکرمؐ کے یہ بارہ خلفاء اسلام کی عزت و شوکت کا سبب بنیں گے.گذشتہ روایات میں موجود اوصاف کو مد نظر رکھنے سے یہ بات آفتاب کی مانند روشن ہوجاتی ہے کہ وہ اہل بیتؑ جن کی پیروی کا پیغمبر اکرمؐ نے حکم فرمایا ہے ان سے آنحضرتؐ کی مراد وہی بارہ ائمہ[ع]ہیں جن کی پیروی کرنے اور احکام فقہ میں ان سے تمسک اختیار کرنے کو شیعہ اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں۔

[1] نہج البلاغہ (صبحی صالح)خطبہ ۱۴۴.

انتیسواں سوال

کیا ابوطالبؑ ایمان کے ساتھ اس دنیا سے گئے ہیں کہ آپ ان کی زیارت کے لئے جاتے ہیں؟

جواب: حضرت علی ۔ کے والد ماجد، رسولؐ کے چچا جناب ابوطالب بن عبدالمطلب شیعوں کے عقیدے کے مطابق نبی اکرمؐ کی رسالت پر مکمل ایمان رکھتے تھے اور وہ صدر اسلام کی تمام سختیوں اور مشکلات میں آنحضرتؐ کے سب سے بڑے حامی و ناصر تھے.

خاندان جناب ابوطالبؑ

جناب ابوطالبؑ نے ایسے گھر میں آنکھ کھولی جس کی سرپرستی پیغمبر اکرمؐ کے جد امجد دین ابراہیمی کے پیرو جناب عبدالمطلب کے ہاتھوں میں تھی جزیرۂ عرب کی تاریخ میں معمولی غور و فکر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جناب عبدالمطلب اپنی زندگی کے سخت ترین حالات اور پر خطر مراحل کے دوران بھی خدا پرستی اور آئین توحید کی حمایت سے دستبردار نہیں ہوئے تھے.جس وقت ابرہہ کا لشکر ہاتھیوں پر بیٹھ کر خانہ کعبہ کو ویران کرنے کے قصد سے مکہ کی طرف آرہا تھا تو اس نے راستے میں جناب عبدالمطلب کے اونٹوں کو پکڑلیا تھا اور جس وقت جناب عبدالمطلب اپنے اونٹوں کے مطالبے کے لئے ابرھہ کے پاس پہنچے تو اس نے بڑے ہی تعجب کے ساتھ ان سے پوچھا کہ آپ نے مجھ سے اپنے اونٹوں کا مطالبہ تو کیا لیکن مجھ سے یہاں سے واپس جانے اور خانہ کعبہ کو ویران نہ کرنے کا مطالبہ نہیں کیا ؟اس وقت جناب عبدالمطلب نے اپنے ایمان و اعتقاد پر بھروسہ کرتے ہوئے اسے یہ جواب دیا تھا : أنا رب الاِبل وللبیت رب یمنعہ (یحمیہ[1]).میں اونٹوں کا مالک ہوں اور اس گھر (خانہ کعبہ) کا بھی مالک موجود ہے جو خود اس کی حفاظت و حمایت کرے گا.اس کے بعد جناب عبدالمطلب مکہ کی طرف روانہ ہوگئے.پھر مکہ میں خانہ کعبہ کے دروازے کی کنڈی پکڑ کر یوں کہا: یا رب لاأرجو لھم سواکا یارب فامنع منھم حماکاِان عدوالبیت مَن عاداکا امنعھم أن یخرّبوا فناکا[2] اے پروردگار میں تیرے

[1] کامل ابن اثیر جلد ۱ ص ۲۶۱ طبع مصر ، ۱۳۴۸ ھ.
[2] گذشتہ حوالہ.

سوا کسی سے امید نہیں رکھتا .پروردگارا!تو خود ان دشمنوں کے مقابلے میں اپنے حرم کی حفاظت فرما.اس گھر کے دشمن تجھ سے جنگ کرنا چاہتے ہیں انہیں روک دے تاکہ تیرے گھر کو ویران نہ کرسکیں .اس قسم کے بلند پایہ اشعار جناب عبدالمطلب کے مومن اور خدا پرست ہونے کے واضح گواہ ہیں اسی وجہ سے یعقوبی نے اپنی تاریخ کی کتاب میں جناب عبدالمطلب کے متعلق یوں تحریر کیا ہے:رفض عبادة الأصنام و وحّد اللہ عزّ وجلّ[1]. عبدالمطلب نے بتوں کی پوجا سے انکار کیا تھا اور آپ خدا کے موحد بندے تھے .آئیے اب یہ دیکھا جائے کہ اس ومن اور خدا پرست شخصیت کی نگاہ میں ان کے بیٹے ابوطالب کی کیا منزلت تھی؟

عبدالمطلبؑ کی نگاہ میں ابوطالبؑ

تاریخ شاہد ہے کہ بعض روشن ضمیر نجومیوں نے جناب عبدالمطلب کو پیغمبراکرمؐ کے روشن مستقبل اور ان کی نبوت سے باخبر کردیا تھا جس وقت ''سیف بن ذی یزان ''نے حکومت حبشہ کی باگ ڈور سنبھالی تو جناب عبدالمطلب ایک وفد کے ہمراہ حبشہ تشریف لے گئے اس وقت ''سیف بن ذی یزان'' نے ایک اہم خطاب کے بعد جناب عبدالمطلب کو یہ خوشخبری دی ''آپ کے خاندان میں ایک عظیم القدر نبیؐ تشریف لاچکے ہیں'' اس کے بعد اس نے پیغمبراکرمؐ کے خصوصیات یوں بیان کئے:اسمہ محمد [ص]یموت أبوہ و أمہ ویکفلہ جدّہ و عمّہ[2].انکا نام محمدؐ ہے انکے ماں باپ کا (جلد ہی) انتقال ہوجائے گااور ان کی سرپرستی ان کے دادا اور چچا کریں گے.

اس وقت اس نے پیغمبراکرمؐ کے صفات بیان کرتے ہوئے یہ جملے بھی کہے تھے:یعبد الرّحمٰن و یدحض الشیطان و یخمد النیران و یکسّر الأوثان قولہ فصل و حکمہ عدل و یأمر بالمعروف و یفعلہ و ینھیٰ عن المنکر و یبطلہ[3].وہ خدائے رحمن کی عبادت کریں گے، شیطان کے دام میں نہیں آئیں گے، جہنم کی آگ کو بجھائیں گے اور بتوں کو توڑیں گے .ان کا قول حق و باطل میں جدائی کا میزان ہوگا وہ دوسروں کو نیکی کا حکم دیں گے اور خود بھی اس پر عمل پیرا ہوں گے وہ دوسروں کو برائی سے روکیں گے اور اسے باطل قرار دیں

[1] تاریخ یعقوبی جلد۲ ص ۷ طبع مصر.
[2] سیرہ حلبی جلد۱طبع مصر ص ۱۳۶، ۱۳۷ ،اور طبع بیروت ص ۱۱۴-۱۱۵.
[3] گذشتہ حوالہ.

گے. اور پھر اس نے جناب عبدالمطلب سے کہا: اِنک لجدہ یا عبدالمطلب غیر کذب اے عبدالمطلب اس میں کوئی جھوٹ نہیں کہ آپ ان کے دادا ہیں. جناب عبدالمطلب نے جب یہ خوشخبری سنی تو سجدہ شکر بجالائے اور پھر اس بابرکت مولود کے احوال کو یوں بیان کیا :اِنّہ کان لي ابن و کنت بہ معجبا وعلیہ رقیقاً و إنّي زوجتہ کریمۃ من کرائم قومي آمنۃ بنت وھب بن عبد مناف ابن زھرہ فجاء ت بغلام فسمّیتہ محمّدا مات أبوہ و أمہ و کفلتہ أنا و عمّہ (یعني أبا طالب[2]). میرا ایک بیٹا تھا جس سے مجھے بہت زیادہ محبت تھی میں نے اس کی شادی اپنے شرافتمند رشتہ داروں میں سے ایک نیک سیرت خاتون ''آمنہ'' بنت وہب بن عبد مناف سے کی تھی اس خاتون کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا ہے میں نے اس کا نام محمد رکھا ہے اس کے ماں اور باپ دونوں کا انتقال ہوچکا ہے اس کی سرپرستی میں نے اور اس کے چچا ابوطالب نے اپنی ذمہ لی ہے.

جناب عبدالمطلب کے اس کلام سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اس یتیم بچے کے روشن مستقبل سے اچھی طرح باخبر تھے اس لئے انہوں نے اس بچے کو اپنے سب سے عزیز بیٹے جناب ابوطالب کی سرپرستی میں دیا تھا اور اس عظیم سعادت کو کسی اور کے نصیب میں نہیں آنے دیا تھا اس سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ جناب ابوطالب اپنے مومن اور موحد والد کی نگاہ میں ایمان کے اس درجہ پر فائز تھے کہ صرف وہی پیغمبر اکرمؐ کی سرپرستی کی لیاقت رکھتے تھے[3].

اب ہم مزید وضاحت کے لئے جناب ابوطالب کے ایمان پر چند واضح دلیلیں پیش کرتے ہیں: جناب ابوطالب کے مومن ہونے کی دلیلیں ۱۔ جناب ابوطالب کے علمی اور ادبی آثار مسلمان مورخین اور علماء نے جناب ابوطالب کے بہت سے بلیغ قصیدے اور متعدد قسم کے علمی و ادبی آثار نقل کئے ہیں جو ان کے محکم ایمان کی دلیل ہیں یہاں ہم ان کثیر آثار میں سے بعض کا تذکرہ کرتے ہیں: لیعلم خیار الناس أن محمّدا نبي کموسیٰ والمسیح ابن مریم اتانا بھدیٍ مثل ما أتیا بہ فکل بأمر اللہ یھدي و یعصم[4] شریف لوگ یہ جان لیں کہ وسیٰ و

---

[1] گذشتہ حوالہ.
[2] سیرہ حلبی جلد۱ ص ۱۳۷ طبع مصر.
[3] زیادہ وضاحت کے لئے ان کتابوں ''سیرہ حلبی'' جلد۱ ص ۱۳۴ طبع مصر اور ''سیرہ ابن ہشام''جلد۱ ص۱۸۹ ،طبع بیروت اور ''ابوطالب مومن قریش'' ص ۱۰۹ طبع بیروت اور'' طبقات کبریٰ''جلد ۱ ص۱۱۷ طبع بیروت کا مطالعہ مفید ہوگا.
[4] ''کتاب الحجۃ''ص ۵۷ اور اسی کے مثل مستدرک جلد ۲ ص ۶۲۳طبع بیروت میں بھی موجود ہے.

عیسیٰ ابن مریم کی طرح محمد بھی نبی خدا ہیں وہ ہمارے لئے اسی طرح کا پیغام ہدایت لائے ہیں جیسا کہ یہ دو نبی لائے تھے پس سارے نبی، خدا کے حکم سے ہدایت کرتے ہیں اور گناہوں سے روکتے ہیں. ألم تعلموا أنا وجدنا محمداً رسولاً کموسیٰ خط في أول الکتب و أن علیه في العباد محبة ولا حیف فیمن خصه الله بالحب کیا تم نہیں جانتے کہ ہم نے موسیٰ کی طرح محمد (ص) کو بھی رسول پایا ہے جن کا ذکر پہلی (آسمانی) کتابوں میں بھی آیا ہے؟ لوگ ان سے محبت کرتے ہیں اور جس شخص کے دل کو خداوندعالم نے انکی محبت کیلئے چن لیا ہے اس پر افسوس نہ کیا جائے لقد أکرم الله النبيّ محمداً فأکرم خلق الله في الناس أحمد و شق له من اسمه لیجله فذوالعرش محمود وهذا محمد[2] خداوندعالم نے اپنے نبی محمد [ص] کو مکرم قرار دیا ہے اس اعتبار سے وہ مخلوقات خدا میں سب سے زیادہ مکرم ہیں پروردگار نے ان کے نام کو اپنے نام سے مشتق کیا ہے پس صاحب عرش محمود ہے اور یہ محمدؐ ہیں.

والله لن یصلوا الیک بجمعهم حتی أوسد في التراب دفینن فاصدع بأمرک ما علیک غضاضة وابشر بذاک و قر منک عیونا و دعوتني و علمت أنک ناصحي ولقد دعوت وکنت ثم أمینا ولقد علمت بأن دین محمد من خیر أدیان البریة دینا[3] (اے رسول خداؐ) خدا کی قسم ہرگز آپؐ کے دشمن آپؐ تک نہ پہنچ پائیں گے یہاں تک کہ میں خاک تلے دفن ہوجاؤں پس آپ کو جس چیز کا حکم ملا ہے بے خوف و خطر اس کا اظہار کریں اور بشارت دے کر آنکھوں کو ٹھنڈک عطا فرمائیں آپؐ نے مجھے اپنے دین کی طرف دعوت دی ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپؐ میرے خیر خواہ ہیں بے شک آپؐ اپنی دعوت میں امانت دار ہیں میں نے یہ جان لیا ہے کہ محمدؐ کا دین دنیا کے سارے دینوں سے بہتر ہے یا شاهد الله عليّ فاشهد إنّي علیٰ دین النبيّ أحمد من ضلّ في الدین فإنّي مهتدي[4] اے خدا کے مجھ پر گواہ آپ گواہی دیجئے کہ میں احمد، رسول خدا کے دین پر ہوں کوئی اپنے دین میں گمراہ ہو تو ہو، میں تو ہدایت یافتہ ہوں. و: جناب ابوطالب نے اپنی بابرکت زندگی کے آخری ایام میں قریش کے سرداروں کو جمع کرکے ان اشعار کے ذریعہ انہیں پیغمبر اکرمؐ کی مکمل طور پر حمایت

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۱ ص ۴۲ ،اور شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید) جلد۱۴ ص۷۲ (طبع دوم)

[2] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد۱۴ ص ۷۸ طبع دوم، تاریخ ابن عساکر جلد ۱ ص ۲۷۵،تاریخ ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۲۶۶، تاریخ الخمیس جلد۱ ص ۲۵۴.

[3] خزانہ الادب بغدادی جلد۱ ص ۲۶۱ اور تاریخ ابن کثیر جلد ۳ ص ۴۲ ، اور شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید) جلد ۱۴ ص ۵۵ (طبع دوم) اور فتح الباری جلد۷ ص ۱۵۳ .۱۵۵. اور الاصابہ جلد۴ ص ۱۱۶ (طبع مصر) ۱۳۵۸ ھ. اور دیوان ابی طالب ص ۱۲.

[4] شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید) جلد ۱۴ ص۷۸ اور دیوان ابوطالب ص ۷۵.

کرنے کی دعوت دی تھی:أوصي بنصر الخير أربعة ابني عليًا و شيخ القوم عباسا و حمزة الأسد الحامي حقيقه و جعفر أن تذودوا دونه الناسا كونوا داءً لكم أمي وما ولدت في نصر أحمد دوني الناس اترا سا میں چار لوگوں کو سب سے افضل نبی کی مدد کرنے کی تاکید کرتا ہوں. اپنے بیٹے علیؑ، اپنے قبیلے کے بزرگ عباس، شیر خدا اور مدافع پیغمبرؐ حمزہ اور (اپنے بیٹے)جعفر کو نصیحت کرتا ہوں کہ آنحضرتؐ کے ہمیشہ ناصر و مددگار رہیں اور تم لوگ (میری ماں اور ان کی تمام اولادیں تم سب پر قربان ہوں) احمد کی مدد کے لئے لوگوں کے سامنے سپر بن جانا! ہر روشن ضمیر اور انصاف پسند شخص ان بلیغ ادبی آثار (جو صراحت کے ساتھ جناب ابوطالب کے خدا اور رسول پر ایمان کامل کی گواہی دے رہے ہیں) کو دیکھ کر شیعوں کے جناب ابوطالب کے ایمان کے سلسلے میں نظریئے کو صحیح مان لے گا اور چند سیاسی اہداف کی خاطر بعض مصنفین کی طرف سے مومن قریش، عم پیغمبرؐ اور صدر اسلام کے سخت حالات میں شریعت کے محافظ جناب ابوطالب پر لگائی جانے والی تہمتوں پر افسوس کرے گا.

۲۔جناب ابوطالبؑ کا پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ نیک سلوک ان کے ایمان کی علامت ہے۔تمام مشہور مسلمان مورخین نے جناب ابوطالب کی پیغمبر اسلامؐ کے سلسلے میں فداکاریوں کو نقل کیا ہے اور یہ چیز جناب ابوطالب کے محکم ایمان کی واضح دلیل ہے کہ جناب ابوطالب نے اسلام کی حمایت اور پیغمبرؐ خدا کی حفاظت کے لئے آنحضرتؐ کے ساتھ تین سال تک اپنا گھر چھوڑ کر ''شعب ابی طالب'' میں زندگی گزاری تھی اور انہوں نے اپنی اس زندگی کو قبیلہ قریش کی سرداری پر ترجیح دی تھی اور مسلمانوں کی اقتصادی پابندی کے خاتمے تک انتہائی سخت حالات ہونے کے باوجود آنحضرتؐ کے ہمراہ رہ کر تمام مشکلات کو برداشت کیا تھا[۲]۔اس سے بڑھ کر یہ کہ جناب ابوطالب نے اپنے عزیز ترین فرزند حضرت علیؑ کو بھی حضور اکرمؐ کی نصرت کرنے اور صدر اسلام کی مشکلات میں آنحضرتؐ کا ساتھ نہ چھوڑنے کا حکم دیا تھا.ابن ابی الحدید معتزلی نے نہج البلاغہ کی شرح میں جناب ابوطالب کے ان جملوں کو نقل کیا ہے جو انہوں نے حضرت علیؑ سے کہے تھے ملاحظہ ہو'': پیغمبر خداؐ تمہیں صرف نیکی کی طرف دعوت دیتے ہیں لہذا کبھی ان کا

---

[۱] متشابہات القرآن ، (ابن شہر آشوب) سورہ حج کی اس آیت (ولینصرن اللہ من ینصرہ)کی تفسیر سے ماخوذ.
[۲] اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لئے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ فرمائیں: ۱۔ سیرہ حلبی جلد ۱ ص ۱۳۴ (طبع دوم مصر)

ساتھ نہ چھوڑنا'' اس اعتبار سے جناب ابوطالب کی وہ خدمات جو آپ نے پیغمبر خداؐ کے سلسلے میں انجام دی ہیں اور آپ کی اسلام کے دفاع میں بے لوث فداکاریاں آپ کے ایمان کی واضح گواہ ہیں،اسی بنیاد پر عالم اسلام کے بزرگ دانشور (ابن ابی الحدید) نے پیغمبر خداؐ کی حفاظت اور دین اسلام کی خدمت کے سلسلے میں جناب ابوطالب کے زندہ کردار سے متعلق یہ اشعار کہے ہیں:

ولولا أبوطالب و ابنہ

لما مثّل الدین شخصًا فقاما

فذاک بمکۃ آوی و حامي

وھذا بیثرب جسّ الحماما

وما ضرّ مجد أبي طالب

جھول لغي أو بصیر تعامیٰ[2]

اگر ابوطالب اور ان کے بیٹے (حضرت علیؑ) نہ ہوتے تو ہرگز دین اسلام کو استحکام حاصل نہ ہوتا ا ابوطالب نے مکہ میں پیغمبر اکرمؐ کو پناہ دی تھی اور ان کی حمایت کی تھی اور ان کے بیٹے نے یثرب میں (پیغمبر اسلامؐ کی نصرت کے لئے)اپنی جان کی بازیاں لگائی تھیں .

۳۔ابوطالب کی وصیت ان کے ایمان کی گواہ ہےعالم اسلام کے مشہور مورخین جیسے ''حلبی شافعی'' نے اپنی کتاب سیرۂ حلبی میں اور '' محمد دیار بکری'' نے اپنی کتاب تاریخ الخمیس میں لکھا ہے کہ جناب ابوطالب نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنے قبیلے سے پیغمبر اسلامؐ کی نصرت کے سلسلے میں یہ وصیت کی تھی:یا معشر قریش کونوا لہ ولاۃ، و لحزبہ حماۃ ، واللّٰہلایسلک أحد منکم سبیلہ اِلاّ رشد،ولا یأخذ أحدبھدیہ اِلاّ سعد، ولوکان لنفسي مدۃ ولأجلي تأخر لکففت عنہ الھزائز، ولدفعت عنہ الدواھي، ثم ھلک[3]۔ اے قبیلہ قریش!تم سب

[1] شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید) جلد۱۴ ص ۵۳طبع دوم.
[2] شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید)جلد۱۴ ص ۸۴ طبع ۳.
[3] تاریخ الخمیس جلد۱ ص ۳۰۰ اور ۳۰۱، طبع بیروت اور سیرہ حلبی جلد۱ص ۳۹۱(طبع مصر)

مصطفی کے محب اور ان کے ماننے والوں کے حامی و ناصر بن جاؤ خدا کی قسم تم میں سے جو شخص بھی ان کے نقش قدم پر چلے گا وہ ضرور ہدایت پائے گا اور جو کوئی ان سے ہدایت حاصل کرے گا وہ کامیاب ہوجائے گا اگر میری زندگی باقی رہتی اور موت نے مجھے مہلت دی ہوتی تو میں یقیناً فتنوں اور سختیوں سے آنحضرتؐ کی محافظت کرتا اور پھر یہ آخری کلمات کہتے کہتے جناب ابوطالب نے داعی اجل کو لبیک کہا تھا.

۴۔پیغمبر خداؐ کی ابوطالب سے محبت ان کے ایمان کی دلیل ہےپیغمبر خداؐ نے مختلف موقعوں پر اپنے چچا ابوطالب کا احترام و اکرام کیا ہے اور ان سے اپنی محبت کا اظہار فرمایا ہے یہاں ہم ان میں سے صرف دو کا تذکرہ کرتے ہیں: الف:بعض مورخین نے اپنی کتابوں میں پیغمبر اسلامؐ کی درج ذیل روایت نقل کی ہے جس میں آپؐ نے جناب عقیل بن ابی طالب سے مخاطب ہوکر یوں فرمایا ہے:إني احبک حبّین حبّا لقرابتک منيّ و حبّا لما کنت أعلم من حب عمي إیاک[1] ® میں تم سے دوہری محبت کرتا ہوں ایک تمہاری مجھ سے قریبی رشتے داری کی وجہ سے ہے اور دوسری محبت اس وجہ سے ہے کہ میں جانتا ہوں ابوطالب تم سے بہت محبت کرتے تھے.

ب:حلبی نے اپنی کتاب سیرت میں پیغمبر خداؐ کی یہ روایت نقل کی ہے جس میں آپؐ نے جناب ابوطالب کی تعریف فرمائی ہے: مانالت قریش منيّ شیءا أکرہہ (أي أشد الکراہۃ)حتی مات أبوطالب[2]. جب تک ابوطالب زندہ رہےمجھے قریش کسی بھی قسم کی تکلیف نہیں پہنچا سکے۔رسول خداؐ کا ابوطالب سے محبت کرنا اور ان کی خدمات کو سراہنا جناب ابوطالب کے محکم ایمان کی واضح دلیل ہے کیونکہ پیغمبر خداؐ صرف مومنین ہی سے محبت رکھتے تھے اور مشرکین و کفار سے سخت گیری کرتے تھے جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:(مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللہِ وَالَّذِینَ مَعَہُ أَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَاءُ بَیْنَہُمْ[3]...) محمد [ص]اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لئے سخت ہیں اور آپس میں انتہائی مہربان ہیں.ایک اور جگہ فرماتا ہے: (لاَتَجِدُ قَوْمًا یُؤْمِنُونَ بِاللہِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ یُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللہَ

[1] تاریخ الخمیس جلد١ ص ١٦٣(طبع بیروت) الاستیعاب جلد٢ ص٥٠٩
[2] سیرہ حلبی جلد١ ص ٣٩١(طبع مصر).
[3] سورہ فتح آیت:٢٩.

وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ[1]...) آپ کو کبھی ایسے افراد نہیں ملیں گے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے (بھی) ہوں لیکن اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت رکھتے ہوں اہے وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان والے ہی کیوں نہ ہوں یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے.ان آیات کا جب پیغمبر اکرمؐ کی ابوطالب سے محبت اور مختلف موقعوں پر ان کی ستائش سے موازنہ کیا جائے تو اس بات میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ جناب ابوطالب ایمان کے اعلی ترین درجہ پر فائز تھے.

۵ ـ حضرت علی ـ اور اصحاب رسولؐ کی گواہی حضرت امیرالمومنین ـ اوراصحاب پیغمبرؐ نے جناب ابوطالب کے محکم ایمان کی گواہی دی ہے ملاحظہ ہو:الف:جس وقت حضرت امیرالمومنین علی ـ کی خدمت میں ایک شخص نے جناب ابوطالب پر ایک ناروا تہمت لگائی تو حضرت علی ـ کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں ہوگئے اور آپ نے فرمایا :مَہ، فضّ اللہ فاک والذي بعث محمّدا با لحق نبیّا لو شفع أبي في کل مذنب علیٰ وجہ الأرض لشفعہ اللہ[2]. چپ رہ! اللہ تیرے منہ کو توڑ دے مجھے قسم ہے اس خدا کی جس نے محمدؐ کو برحق نبی قرار دیا ہے اگر میرے والد (ابوطالب)روئے زمین کے سارے گناہ گاروں کی شفاعت کرنا چاہیں تو بھی پروردگار ان کی شفاعت کو قبول کرے گا.ایک اورجگہ فرماتے ہیں: کان واللہ ابوطالب عبدمناف بن عبدالمطلب مؤمنا مسلما یکتم إیمانہ مخافۃ علیٰ بني ہاشم أن تنابذھا قریش[3]. خدا کی قسم ابوطالب عبدمناف بن عبدالمطلب مومن اور مسلمان تھے اور اپنے ایمان کوقریش کے کفار سے مخفی رکھتے تھے تاکہ وہ بنی ہاشم کو ستا نہ سکیں.حضرت علی ـ کے یہ ارشادات نہ صرف جناب ابوطالب کے ایمان کی تائید کرتے ہیں بلکہ ان کو ایسے اولیائے خدا کی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں جو پروردگار عالم کے اذن سے شفاعت کا حق رکھتے ہیں.

---

[1] سورہ مجادلہ آیت: ۲۲.
[2] الحجۃ ص ۲۴.
[3] الحجۃ ص ۲۴.

ب: جناب ابوذر غفاریؓ نے جناب ابوطالب کے بارے میں کہا ہے:واللہ الذي لاإلہ إلا ھو ما مات ابوطالبِ حتیٰ أسلم[1]. قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ابوطالبؑ اسلام لانے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں.

ج:عباس بن عبدالمطلب اور ابوبکر بن ابی قحافہ سے بھی بہت سی سندوں کے ساتھ یہ روایت نقل ہوئی ہے: إن أباطالب مامات حتیٰ قال: لاالہ الا اللہ محمد رسول اللّٰہ.بے شک ابوطالب ''لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کہنے کے بعد دنیا سے رخصت ہوئے ہیں.

٦۔ابوطالب اہل بیتؑ کی نگاہ میں ائمہ معصومین [ع] نے جناب ابوطالب کے ایمان کو صاف لفظوں میں بیان فرمایا ہے اور مختلف موقعوں پر پیغمبر اسلامؐ کے اس فداکار کا دفاع کیا ہے یہاں پر ہم ان میں سے صرف دو نمونوں کا تذکرہ کرتے ہیں:الف:امام محمد باقر ـ فرماتے ہیں:لووضع إیمان أبي طالبِ في کفۃ میزان و إیمان ھذا الخلق في الکفۃ الأخری لرجح إیمانہ[3].اگر ابوطالب کے ایمان کو ترازو کے ایک پلڑے میں اور تمام مخلوقات کے ایمان کو اس کے دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو ایمان ابوطالب ان کے ایمان سے بھاری ہوگا.

ب:امام جعفرصادق ـ رسول اکرمؐ سے نقل فرماتے ہیں: إن أصحاب الکھف أسرّوا الایمان و أظھروا الکفر فآتاھم اللہ أجرھم مرّتین و إن أباطالب أسرّ الایمان و أظھر الشرک فآتاہ اللہ أجرہ مرتین[4].اصحاب کہف (چند مصلحتوں کی وجہ سے) اپنے ایمان کو چھپا کر کفر کا اظہار کرتے تھے تو پروردگار عالم نے انہیں دہرا اجر عطا فرمایا تھا.ابوطالب نے بھی اپنے ایمان کو چھپا کر (کسی مصلحت کی وجہ سے) شرک کا اظہار کیا تو انہیں بھی پروردگارعالم نے دوہرا اجر دیا ہے. گزشتہ دلیلوں کی روشنی میں آفتاب کی طرح واضح و روشن ہوجاتا ہے کہ جناب ابوطالب درج ذیل بلند مقامات پر فائز تھے:١۔خدا و رسولؐ پر محکم ایمان.

٢۔پیغمبر خداؐ کے بے لوث حامی و ناصر اور راہ اسلام کے فداکار.

٣۔پیغمبر اکرمؐ کے بے نظیر محبوب.

---

[1] شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید) جلد۱۴ ص۷۱(طبع دوم).
[2] الغدیر ، جلد ۷ ص۳۹۸ تفسیر وکیع سے نقل کرتے ہوئے (طبع۳ بیروت ۱۳۷۸ ھ).
[3] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱۴ ص ۶۸ (طبع دوم) الحجۃ ص۱۸.
[4] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱۴ ص ۷۰ (طبع دوم)الحجۃ ص۱۱۵.

۴۔خداوند عالم کے نزدیک عہدۂ شفاعت کے مالک.اس اعتبار سے ثابت ہوجاتا ہے کہ جناب ابوطالب پر لگائی گئی نسبتیں باطل اور بے بنیاد ہیں.جو کچھ بیان ہوچکا ہے اس سے دو حقیقتیں آشکار ہوجاتی ہیں:ا۔پیغمبر اکرمؐ، جناب امیرالمومنینؑ، ائمہ معصومین[ع]اور اصحاب پیغمبر[ص]کی نگاہ میں جناب ابوطالب ایک باایمان شخص تھے.

۲۔جناب ابوطالب پر کفر کا الزام باطل اور بے بنیاد ہے اور ان پر یہ تہمت بنی امیہ اور بنی عباس (جو ہمیشہ سے اہل بیت[ع]اور جناب ابوطالب کی اولاد سے جنگ کرتے آئے ہیں) کے اشاروں پر بعض سیاسی مفادات کے تحت لگائی گئی تھی.اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس حدیث کا جائزہ لیں جو ''حدیث ضحضاح'' کے نام سے مشہور ہے اور جسے بعض لوگوں نے سند قرار دیتے ہوئے جناب ابوطالب کی شخصیت کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے ہم یہاں قرآنی آیات ، سنت نبویؐ اور عقل کی روشنی میں اس حدیث کے باطل اور بے بنیاد ہونے کے دلائل پیش کریں گے:حدیث ضحضاح کا تحقیقی جائزہ بعض مصنفین جیسے بخاری اور مسلم نے ''سفیان بن سعید ثوری'' ''عبدالملک بن عمیر'' ''عبداللہ العزیز بن محمد دراوردی'' ''لیث بن سعد'' جیسے راویوں سے نقل کرتے ہوئے ان دو اقوال کو پیغمبر اکرمؐ سے منسوب کیا ہے:الف:''وجدتہ في غمراتِ من النار فأخرجتہ الی ضحضاح.''

میں نے انہیں آگ کے انبار میں پایا تو انہیں ضحضاح[1]کی طرف منتقل کردیا۔

ب:''لعلہ تنفعہ شفاعتي یوم القیامۃ فیجعل في ضحضاح من النار یبلغ کعبیہ یغلي منہ دماغہ'' قیامت کے دن شاید میری شفاعت ابوطالب کے کام آجائے تاکہ انہیں ضحضاح میں ڈال دیا جائے جس کی گہرائی پاؤں کے ٹخنوں تک ہوگی اور جس میں ان کا (معاذاللہ) دماغ کھولے گا[2]اگرچہ جناب ابوطالب کے ایمان سے متعلق گزشتہ روایات اور دلائل کی روشنی میں اس حدیث ضحضاح کا باطل اور بے بنیاد ہونا اچھی طرح ثابت ہوجاتا ہے لیکن پھر بھی اس مسئلے کی وضاحت کیلئے حدیث ضحضاح سے متعلق دو چیزوں کی تحقیق ضروری ہے: ا۔اس حدیث کے سلسلہ سند کا باطل ہونا.

---

[1] ''ضحضاح ''ایسے گڑھے کو کہتے ہیں جس کی گہرائی آدمی کے قد سے کچھ کم ہو.

[2] صحیح بخاری جلد۵ ابواب مناقب باب قصہ ابوطالب ص۵۲ اور جلد ۸ کتاب الادب باب کنیۃ المشرک ص ۴۶طبع مصر.

٢۔اس حدیث کے متن کا کتاب خدا اور سنت پیغمبرؐ بر خلاف ہونا۔ حدیث ضحضاح کے سلسلہ سند کا باطل ہونا ہم نے بیان کیا تھا کہ اس حدیث کے راوی ''سفیان بن سعید ثوری''''عبدالملک بن عمیر'' ''عبدالعزیز بن محمد دراوردی'' اور ''لیث بن سعد''ہیں اب ہم ان راویوں کے سلسلے میں اہل سنت کے علمائے رجال کے نظریات کی تحقیق کریں گے:الف: ''سفیان بن سعید ثوری'' ابوعبداللہ بن احمد بن عثمان ذہبی کا شمار اہل سنت کے بزرگ مرتبہ علمائے رجال میں ہوتا ہے انہوں نے سفیان بن سعید ثوری کے بارے میں یوں کہا ہے: ''کان یدلس عن الضعفاء[1]'' سفیان بن سعید ثوری ضعیف راویوں کی گھڑی ہوئی حدیثیں نقل کرتا تھا۔ ذہبی کا یہ کلام اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سفیان ثوری ضعیف اور مجہول الحال قسم کے افراد سے حدیثیں نقل کیا کرتا تھا اس اعتبار سے اس کی نقل کی ہوئی حدیثوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

ب:عبدالملک بن عمیراس کے بارے میں ذہبی نے بھی کہا ہے: طال عمرہ وساء حفظہ ،قال أبوحاتم لیس بحافظ تغیر حفظہ و قال أحمد: ضعیف یخلط و قال ابن معین : مخلط و قال ابن خراش کان شعبۃ لایرضاہ و ذکر الکوسج عن أحمد أنہ ضعفہ جدا[2]۔اس کی عمر زیادہ ہوگئی تھی اور اس کا حافظہ کام نہیں کرتا تھا اور اسی طرح ابوحاتم نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ : اس کے اندر حدیثیں حفظ کرنے کی قدرت ختم ہوگئی تھی اور اس کی یادداشت جاتی رہی تھی اسی طرح احمد بن حنبل نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ضعیف تھا صحیح حدیث کو جعلی حدیث سے ملا کر بیان کرتا تھا اور ابن معین نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ وہ صحیح اور غلط حدیثوں کو آپس میں ملا دیا کرتا تھا اورابن خراش نے بھی اس کے بارے میں کہا ہے کہ شعبہ بھی اس سے راضی نہ تھے اور کوسج نے احمد ابن حنبل سے یوں نقل کیا ہے کہ وہ عبدالملک بن عمیر کو نہایت ہی ضعیف قسم کا شخص شمار کرتے تھے۔گذشتہ اقوال کے مجموعے سے معلوم ہوتا ہے ''عبدالملک بن عمیر'' درج ذیل صفات کا مالک تھا :١۔اس کا حافظہ ختم ہوگیا تھا اور وہ بھول جاتا تھا۔

٢۔ علم رجال کی اصطلاح میں وہ ایک ضعیف شخص تھا اور اسکی روایات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] میزان الاعتدال (ذہبی) جلد٢ ص١٦٩طبع ١ بیروت ١٣٨٢ ھ.
[2] میزان الاعتدال جلد٢ ص٦٦٠(طبع ١، بیروت)

۳۔بہت زیادہ غلطیاں کرنے والا شخص تھا.

۴۔ صحیح اور غلط کو آپس میں ملا کر بیان کرنے والا شخص تھا۔ واضح ہے کہ مذکورہ صفات میں سے صرف ایک صفت بھی عبدالملک بن عمیر کو ضعیف اور ناقابل اعتماد شخص قرار دینے کیلئے کافی تھی جبکہ اسکے اندر تو یہ سارے نقائص جمع تھے.

ج:عبدالعزیز بن محمد دراوردیاہل سنت کے علمائے رجال نے اسے حافظہ سے بے بہرہ اور بھول جانے والا ایسا شخص قرار دیا ہے کہ جس کی روایات پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا.احمد بن حنبل نے عبدالعزیز بن محمد دراوردی کے بارے میں یہ کہا ہے: إذا حدث من حفظه جاء ببواطيل[1].جب بھی وہ اپنے حافظے سے کوئی روایت نقل کرتا ہے تو وہ باطل اور بے ہودہ اقوال سے پر ہوتی ہے.

اسی طرح ابوحاتم نے اس کے بارے میںیہ کہا ہے: ''لا يحتج به[2]''اس کی حدیث کے ذریعہ استدلال نہیں کیا جاسکتا .اور ابوزارعہ نے اسکے بارے میں ''سيّء الحفظ''یعنی اس کا حافظہ صحیح نہیں تھا جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں[3].

د:لیث بن سعداہل سنت کے علمائے رجال کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ وہ راوی جن کے نام ''لیث'' ہیں وہ سب ایسے مجہول الحال یا ضعیف افراد ہیں جن کی نقل کی ہوئی احادیث پر عمل اور اعتماد نہیں کیا جاسکتا[4] لیث بن سعد بھی انہی ضعیف اور لاپرواہ افراد میں سے تھا جو احادیث کے سننے اور ان کے راویوں سے لینے میں انتہائی لاپرواہی سے کام لیتے تھے.یحیی بن معین نے اسکے بارے میں کہا ہے: إنّه كان يتساهل في الشيوخ والسماع[5].لیث بن سعد،افراد سے حدیث لینے اور سننے میں لاپرواہی کیا کرتا تھا''بناقی''نے بھی اسے ضعیف افراد میں قرار دیا ہے اور اپنی کتاب ''التدليل على الكامل'' (جسے انہوں نے ضعیف افراد کی پہچان کے لئے لکھا ہے) میں ''لیث بن سعد ''کے نام کا بھی ذکر کیا ہے[6].اس بیان سے معلوم ہوجاتا ہے کہ حدیث'' ضحضاح''کے سارے راوی انتہائی ضعیف تھے لہذا ان سے منقول احادیث پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا.

---

[1] گذشتہ حوالہ ص۶۳۴.
[2] گذشتہ حوالہ.
[3] گذشتہ حوالہ ص ۶۳۴.
[4] میزان الاعتدال جلد۳ ص ۴۲۰تا ۴۲۳ طبع ۱ ،بیروت.
[5] گذشتہ حوالہ ص ۴۲۳.
[6] شیخ الابطح ص۷۵ اور میزان الاعتدال جلد۳ ص۴۲۳.

حدیث ضحضاح کا مضمون قرآن و سنت کے خلاف ہے اس حدیث میں پیغمبر اکرمؐ کی طرف نسبت دی گئی ہے کہ آپؐ نے جناب ابوطالب کو (معاذاللہ) آگ کے شعلوں کے انبار سے نکال کر ضحضاح کی طرف منتقل کر دیا تھا اس اعتبار سے پیغمبر اکرمؐ نے ان کے عذاب میں کمی کرا دی تھی یا آنحضرتؐ نے قیامت کے دن ان کے حق میں شفاعت کرنے کی آرزو کی تھی جبکہ قرآن مجید اور سنت نبویؐ کے اعتبار سے آنحضرتؐ کا عذاب میں کمی کرانے یا شفاعت کرنے کا حق صرف مومنوں اور مسلمانوں سے ہی مخصوص ہے لہذا اگر (معاذاللہ) جناب ابوطالب کافر ہوتے تو ہرگز پیغمبر اکرمؐ ان کے عذاب میں کمی یا ان کی شفاعت کی آرزو نہ کرتے.

اس اعتبار سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ (حدیث ضحضاح) کا مضمون باطل اور بے بنیاد ہے اب ہم قرآن و سنت کی روشنی میں اس مسئلے کی چند واضح دلیلیں پیش کرتے ہیں:الف: قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:(وَالَّذِين كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَايُقْضَى عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِن عَذَابِهَا كَذَٰلِكَ نَجْزِي كُلَّ كَفُورٍ[1]) اور جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کیلئے جہنم کی آگ ہے نہ تو ان کی قضا آئے گی کہ مر جائیں اور نہ ہی انکے عذاب میں کوئی تخفیف کی جائے گی ہم اسی طرح ہر کفر کرنے والے کو سزا دیا کرتے ہیں.

ب: سنت نبیؐ میں بھی کفار کے حق میں شفاعت کی نفی کی گئی ہے: ابوذر غفاریؓ نے پیغمبر اکرمؐ سے یہ روایت نقل کی ہے: أعطيت الشفاعة وهي نائلة من أمتي مَن لايشرك بالله شيءا مجھے شفاعت کرنے کا حق دیا گیا ہے اور وہ میری امت کے ایسے افراد کے لئے ہوگی جنہوں نے خداوند عالم کے سلسلے میں شرک نہ کیا ہو.لہذا حدیث ضحضاح کا مضمون باطل ،بے بنیاد اور قرآن و سنت کے اصولوں کے خلاف ہے.

نتیجہ:اس بیان کی روشنی میں یہ واضح ہوجاتا ہے کہ حدیث ضحضاح سند و متن کے اعتبار سے ناقابل عمل روایت ہے. اس طرح جناب ابوطالب کی باایمان شخصیت کو داغدار کرنے والی مہمل روایت باطل ہوجاتی ہے اور پیغمبر اکرمؐ کے حامی و ناصر جناب ابوطالب کا ایمان محکم طریقہ سے ثابت ہوجاتا ہے۔

---

[1] سوره فاطر آيت : ٣٦.

تیسواں سوال

کیا شیعوں کی نظر میں جبرئیل ۔ نے منصب رسالت کے پہنچانے میں خیانت کی ہے اور کیا یہ صحیح ہے کہ انہوں نے حضرت علی کے بجائے قرآن مجید کو رسول اکرمؐ پر نازل کیا ہے؟

جواب: بعض جاہل اور خود غرض افراد نے شیعوں پر یہ تہمت لگائی ہے.اس مسئلے کے جواب سے پہلے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سوال کے پیدا ہونے کا اصلی سبب بیان کردیں:اس تہمت کا اصلی سبب قرآنی آیات اور احادیث نبوی کے مطابق یہودیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت جبرئیل ۔ نے رسالت کے پہنچانے میں خیانت کی ہے کیونکہ خداوند عالم نے انہیں حکم دیا تھا کہ منصب نبوت کو خاندان اسرائیل میں قرار دیں لیکن انہوں نے پروردگار عالم کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے منصب نبوت کو اولاد اسماعیل میں قرار دے دیا اسی بنیاد پر یہودی جناب جبرئیل کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں[۱]۔

اور ان کے بارے میں ہمیشہ ''خان الامین'' ''جبرائیل نے خیانت کی''کا جملہ استعمال کرتے ہیں اسی وجہ سے قرآن مجید نے ان پر اعتراض کیا ہے اور ان کے نظرئیے کو باطل قرار دیتے ہوئے مندرجہ ذیل آیت میں جناب جبرئیل کو فرشتہ ''امین'' کے نام سے یاد کیا ہے:(نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِين ۃ عَلیٰ قَلْبِکَ لِتَکُون مِن الْمُنذِرِین[۲]) اس(قرآن مجید)کو روح الامین (جبرائیل) لے کر نازل ہوئے ہیں یہ آپ کے قلب پر نازل ہوا ہے تاکہ آپ لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرانے والوں میں سے ہوجائیں.ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:(قُلْ مَن کَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیلَ فَإِنَّہُ نَزَّلَہُ عَلَی قَلْبِکَ بِإِذْنِ اللّہِ[۳]) آپ کہہ دیجئے: جو کوئی جبرئیل کا دشمن ہے وہ یہ جان لے کہ اس نے تو اس قرآن کو حکم خدا سے آپ کے قلب پر نازل کیا ہے.اگر ان آیات کی تفسیر کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ قوم یہود چند وجوہات کی بنا پر جناب جبرئیل کو اپنا دشمن شمار کرتے ہوئے انہیں فرشتہ عذاب اور رسالت پہنچانے میں

---

[۱] تفسیر فخررازی جلد۱ ص ۴۳۶ اور ۴۳۷ طبع مصر ۱۳۰۸ ھ.
[۲] سورہ شعراء آیت: ۱۹۴.
[۳] سورہ بقرہ آیت: ۹۳۔۱۹۴.

خیانت کرنے والا تصور کرتی تھی لہذا اس کلمے ''خان الامین'' کا سرچشمہ قوم یہود کا عقیدہ ہے اور بعض جاہل مصنفین نے شیعوں سے اپنی پرانی دشمنی کے نتیجے میں بے انصافی سے کام لیتے ہوئے یہودیوں کے اس جملے کو شیعہ قوم سے منسوب کردیا ہے. شیعوں کی نگاہ میں منصب نبوتشیعہ، قرآن وسنت کی پیروی اور ائمہ معصومین [ع] کی روایات کی روشنی میں نہ صرف یہ کہ حضرت محمد بن عبداللہ [ص] کو حکم خدا سے ساری دنیا کے لئے نبی برحق سمجھتے ہیں بلکہ وہ آنحضرتؐ کو آخری نبی اور سید المرسلین بھی مانتے ہیں. شیعوں کے پہلے امام حضرت علی بن ابی طالب ـ اپنے اس گہربار کلام میں اس حقیقت کی یوں گواہی دیتے ہیں: وأشهد أن لااله الا الله وحده لاشريک و أشهد أن محمّدا عبده و رسوله خاتم النبيّين و حجة الله علیٰ العالمين! میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں ہے سوائے اس خدائے واحد کے جس کا کوئی شریک نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد خدا کے بندے اس کے رسول، خاتم الانبیاء اور سب جہانوں پر خدا کی حجت ہیں.

امام جعفر صادق ـ نیز فرماتے ہیں'': لم يبعث الله عزّوجلّ من العرب الا خمسة أنبياء هودًا و صالحًا و اسماعيل و شعيبًا و محمّدا خاتم النبيّين [ص]۲.'' خداوند عالم نے پانچ انبیاء کو قوم عرب میں سے مبعوث فرمایا ہے: حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت اسماعیل، حضرت شعیب اور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفی [ص]. یہ حدیث بخوبی شیعوں پر لگائی گئی نسبت کو باطل کردیتی ہے اور حضرت محمد بن عبداللہ کو خدا کے آخری نبی کی حیثیت سے پہچنواتی ہے۳ اسی بنیاد پر تمام شیعہ جناب جبرئیل کو رسالت پہنچانے میں امین سمجھتے ہیں اور اسی طرح ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد بن عبداللہ [ص] خدا کے آخری اور برحق نبی تھے اور حضرت علی بن ابی طالب ـ آنحضرت کے حقیقی وصی اور جانشین تھے۔ یہاں پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کی درج ذیل حدیث پیش کریں جس کے صحیح ہونے پر شیعہ اور سنی دونوں اتفاق نظر رکھتے ہیں اور دونوں ہی فرقوں کے محدثین نے اس حدیث کو اپنی معتبر کتابوں میں نقل کیا ہے یہ حدیث ''حدیث منزلت'' کے نام سے مشہور ہے اس حدیث میں آپ نے اپنی رسالت کی خاتمیت بیان کرنے کے بعد

---

١ نہج السعادة جلد١ ص ١٨٨ طبع بیروت اور کافی جلد ٨صفحہ ٦٧طبع ٢ تہران.
٢ بحار الانوار جلد١١ ص ٤٢ طبع ٢ بیروت ١٤٠٣ ھ
٣ پیغمبراسلامؐ کی خاتمیت کے سلسلے میں زیادہ روایات سے آگاہی کے لئے استاد جعفر سبحانی کی کتاب ''مفاہیم القرآن'' کا مطالعہ فرمائیں.

حضرت علی ـ کو اپنا وصی اور جانشین معین فرمایا ہے پیغمبر اکرم [ص] نے حضرت علیؑ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے: أما ترضیٰ أن تکون منيّ بمنزلة هارون من موسیٰ الا انّہ لانبيّ بعدي[1] (اے علیؑ) کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ تمہاری نسبت مجھ سے ویسی ہی ہے جیسی ہارون کو موسیٰ سے تھی صرف یہ (فرق ہے) کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا. یہ حدیث جو کہ سند کے اعتبار سے شیعہ و سنی محدثین کی نظر میں معتبر ہے شیعوں کے درج ذیل دو نظریوں کی واضح دلیل ہے: ا ـ حضرت محمد بن عبداللہ [ص] خدا کے آخری نبی ہیں.

٢ ـ حضرت علی بن ابی طالب ـ پیغمبر اکرمؐ کے جانشین اور بلافصل خلیفہ ہیں ـ

[1] اس حدیث کے بے شمار ماخذ موجود ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں: ١ـصحیح بخاری جلد٦ ص٣ باب غزوہ تبوک (طبع مصر)
٢ـصحیح مسلم جلد٧ ص ١٢٠ باب فضائل علیؑ (طبع مصر) ٣ـسنن ابن ماجہ جلد١ ص٥٥ باب فضائل اصحاب النبیؐ (طبع اول مصر)
٤ـمستدرک حاکم جلد٣ ص ١٠٩ (طبع بیروت) ٥ـمسند احمد جلد١ ص ١٧٠، ١٧٧، ١٧٩، ١٨٢، ١٨٤، ١٨٥ اور جلد ٣ میں ص ٣٢
٦ـصحیح ترمذی جلد٥ ص٢١ باب مناقب علی بن ابی طالب (طبع بیروت. ٧ـمناقب ابن مغازلی ص ٢٧ طبع بیروت ١٤٠٣ ہـ ٨ـبحارالانوار جلد ٣٧ ص ٢٥٤ طبع ٢ بیروت ١٤٠٣ ہـ ٩ـمعانی الاخبار (شیخ الصدوق) ص٧٤ طبع بیروت ١٣٩٩ ہـ ١٠ـکنزالفوائد جلد٢ ص ١٦٨ طبع بیروت ١٤٠٥ ہـ

اکتیسواں سوال

تقیہ کا معیار کیا ہے؟

جواب:دشمنوں کے مقابلے میں دنیاوی اور دینی نقصانات سے محفوظ رہنے کے لئے اپنے باطنی عقیدے اور ایمان کو چھپانے کا نام تقیہ ہے تقیہ ہر مسلمان شخص کا ایک ایسا شرعی فریضہ ہے جس کا سرچشمہ قرآنی آیات ہیں:قرآن کی نگاہ میں تقیہ قرآن مجید میں تقیہ سے متعلق بہت سی آیات ہیں ان میں سے یہاں ہم بعض کا ذکر کرتے ہیں: (لایَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْکَافِرِینَ أَوْلِیَاءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِینَ وَمَن یَفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَن تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً[1])مومنوں کو چاہیے کہ وہ اہل ایمان کو چھوڑ کر کفار کو اپنا ولی اور دوست نہ بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے گا اس کا خدا سے کوئی تعلق نہ ہوگا مگر یہ کہ تمہیں کفار سے خوف ہو تو کوئی حرج نہیں ہے. یہ آیت بخوبی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ کفار کے ساتھ دوستی رکھنا جائز نہیں ہے لیکن اگر جان خطرہ میں ہو تو تقیہ کرتے ہوئے ان سے ظاہری طور پر دوستی کا اظہار کیا جاسکتا ہے.

ب:(مَن کَفَرَ بِاللّٰہِ مِن بَعْدِ إِیمَانِہِ إِلَّا مَنْ أُکْرِہَ وَقَلْبُہُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِیمَانِ وَلٰکِن مَّن شَرَحَ بِالْکُفْرِ صَدْرًا فَعَلَیْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰہِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیمٌ[2]) جو شخص بھی ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرلے سوائے اس کے جسے کفر پر مجبور کردیا جائے اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو (تو کوئی حرج نہیں ہے)لیکن وہ شخص جس کے سینہ میں کفر کے لئے کافی جگہ پائی جاتی ہو اس کے اوپر خدا کا غضب ہے اور اس کے لئے بہت بڑا عذاب ہے. مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں یہ لکھا ہے :ایک دن کفار نے جناب عمار ابن یاسر کو ان کے ماں باپ کے ہمراہ گرفتار کرلیا اور ان سے کہنے لگے کہ اسلام کو[3] چھوڑ کر کفر و شرک اختیار کرلو تو عماربن یاسر کے ہمراہ افراد نے ان کے جواب میں توحید و رسالت کی گواہیاں دینا شروع کردیں جس پر کفار نے ان میں سے بعض کو شہید کرڈالا اور بعض

---

[1] سورہ آل عمران آیت: ٢٨.
[2] سورہ نحل آیت: ١٠۶
[3] اس سلسلے میں جلال الدین سیوطی کی تفسیر در المنثور جلد۴ ص١٣١ (طبع بیروت) کا مطالعہ کیجئے.

پر طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھانے لگے اس وقت جناب عمار نے اپنے باطنی عقیدے کے برخلاف تقیہ اختیار کرکے ظاہری طور پر کفر کے کلمات کو اپنی زبان پر جاری کیا تو کفار نے انہیں چھوڑ دیا پھر اسکے بعد جناب عمار انتہائی پریشانی کے عالم میں رسول خدا کی خدمت میں پہنچے تو آنحضرت نے انہیں تسلی دی اور پھر اس سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی. اس آیت اور اس کی تفسیر سے بخوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ پیغمبر خداؐ کے زمانے میں اصحاب بھی جان ومال کی حفاظت کے لئے اپنے باطنی عقیدے کو چھپا کر تقیہ کرتے تھے.

تقیہ شیعوں کی نگاہ میں

بنی امیہ اور بنی عباس کے ظالم حکمران ہمیشہ شیعوں سے برسرپیکار رہے ہیں اور انہوں نے شیعوں کے قتل عام میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہ[1]ے اس بنا پر اس زمانے میں شیعوں نے قرآن مجید کے حکم کے مطابق انتہائی سخت حالات میں اپنے سچے عقائد چھپا کر اپنی اور دوسرے مسلمان بھائیوں کی جانیں محفوظ کی تھیں واضح ہے کہ اس ظلم و ستم کی فضا میں شیعوں کے لئے تقیہ کے علاوہ کوئی ایسا چارۂ کار نہیں تھا جو شیعوں کو نابودی سے بچاتا لہٰذا اگر وہ ظالم حکام، شیعوں کے دشمن نہ ہوتے اور شیعوں کا بے گناہ قتل عام نہ کرتے تو ہرگز شیعہ تقیہ اختیار نہ کرتے یہاں پر اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ تقیہ صرف شیعوں سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ دوسرے مسلمان بھی جب اپنے ایسے دشمنوں کے مقابلے میں قرار پاتے ہیں جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے دشمن ہیں (جیسے کہ خوارج اور وہ ظالم حکومتیں جو ہر حرام کام کو جائز سمجھتی ہیں)اور ان سے مقابلہ کی طاقت بھی نہیں ہوتی تو وہ اپنی جان کی حفاظت کی خاطر تقیہ کا سہارا لیتے ہیں اس بنیاد پر اگر اسلامی معاشرے کے تمام افراد اپنے فقہی مذاہب میں اتفاق رائے رکھتے ہوئے وحدت واخوت کی زندگی گزارنا شروع کردیں تو پھر ہرگز انھیں تقیہ کی ضرورت باقی نہیں رہے گی.

---

[1] بنی امیہ اور بنی عباس کے حکام کے حکم پر شیعوں کے بے رحمانہ قتل عام کے سلسلے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لئے ان کتابوں''مقاتل الطالبین''(مصنفہ ابوالفرج اصفہانی) ''شہداء الفضیلۃ(مصنفہ علامہ امینی)''، ''الشیعہ والحاکمون''(مصنفہ محمد جواد مغنیہ)کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا.

نتیجہ:گزشتہ بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ :ا۔تقیہ کی اساس قرآن مجید پر ہے اور صدر اسلام میں پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب بھی تقیہ کرتے تھے اور آنحضرتؐ ان کے اس عمل کی تائید فرماتے تھے یہ سب تقیہ کے جائز ہونے کی دلیلیں ہیں.

۲۔شیعہ اپنے مذہب کو بچانے اور دشمنوں کے سفاکانہ قتل عام سے محفوظ رہنے کے لئے تقیہ کرتے تھے.

۳۔تقیہ صرف شیعوں سے مخصوص نہیں ہے,بلکہ دوسرے مسلمان بھی تقیہ کرتے ہیں.

۴۔تقیہ کرنا اور اپنے باطنی عقائد چھپانا صرف کفار کے مقابلے میں ہی انجام نہیں پاتا بلکہ تقیہ کا معیار (مسلمانوں کی جان بچانا) عمومیت رکھتا ہے اور ہر ایسے ظالم دشمن کے سامنے کہ جس کے ساتھ مقابلے کی قدرت نہ ہو یا اس سے جہاد کرنے کے شرائط پورے نہ ہورہے ہوں تقیہ ضروری ہوجاتا ہے.

۵۔اگر مسلمانوں میں مکمل وحدت اور ہم فکری پیدا ہوجائے تو ہرگز ان کے درمیان تقیہ کی ضرورت باقی نہیں رہے گی.

بتیسواں سوال

ایران کے بنیادی قانون میں کیوں جعفری مذہب (شیعہ اثنا عشری) کو حکومت کا مذہب قرار دیا گیا ہے؟

جواب:اس میں شک نہیں کہ جمہوری اسلامی ایران کے بنیادی قانون کی نظر میں تمام اسلامی مذاہب محترم و معزز شمار کئے جاتے ہیں لیکن یہ بات بھی طے ہے کہ اسلامی و فقہی مذاہب (:جیسے جعفری، مالکی، شافعی، حنبلی ، حنفی و...) کے ماننے والے اپنے فردی اور اجتماعی احکام میں یکساں اور متحد نہیں ہیں اور ان کے درمیان بہت سے اختلافات دکھائی دیتے ہیں دوسری طرف سے ایک معاشرے کے قوانین و حقوق کا آپس میں منظم اوریک رنگ ہونا وقت کی شدید ترین ضرورت ہے اس اعتبار سے واضح ہے کہ ہر سرزمین پر ان مذاہب میں سے صرف ایک مذہب ہی اجتماعی قوانین کو نافذ کرسکتا ہے ۔

اس لئے کہ قانون گزاروں کے مختلف ہونے سے کبھی بھی ایک جیسے اوریکساں قوانین نہیں بنائے جا سکتے اس بنیاد پر یہ ضروری ہے کہ ہر معاشرے میں اسلامی اور فقہی مذاہب میں سے صرف ایک مذہب ہی باضابطہ طور پراجتماعی قوانین کا ماخذ قرار پائے تاکہ اس مملکت کے قوانین و ضوابط میں کسی طرح کی دو روئی اور بد نظمی پیدا نہ ہونے پائے اور فردی و اجتماعی امور میں منظم اوریکساں قوانین و ضوابط بنانے کا زمینہ ہموار ہو سکے جعفری مذہب کی تعیین کا معیار گزشتہ وضاحت کے بعد اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے کس معیار کے تحت تمام مذاہب میں سے صرف جعفری مذہب کو ملک کے قوانین و ضوابط کا ماخذ قرار دیا ہے؟اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے چونکہ ایران میں عوام کی اکثریت ایسے مسلمانوں کی ہے جو جعفری مذہب کو مانتے ہیں لہذا اس ملک کے بنیادی قوانین میں جعفری مذہب کو ملک کا رسمی مذہب قرار دیا گیا جو کہ ایک فطری امر ہے اور تمام منطقی اور حقوقی ضابطوں سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے.ایران میں دوسرے اسلامی مذاہب کا درجہ اگرچہ ایران کے بنیادی قوانین میں جعفری مذہب کو ملک کا رسمی مذہب قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود اس اسلامی مملکت میں دوسرے اسلامی مذاہب (جیسے شافعی، حنبلی

،حنفی، مالکی، اور زیدی کو) نہ صرف محترم شمار کیا گیا ہے. بلکہ ان مذاہب کے ماننے والوں کو درج ذیل امور میں اپنی فقہ پر عمل کرنے میں مکمل اختیار بھی دیا گیا ہے: ا۔ اپنے مذہبی مراسم کے انجام دینے میں.

۲۔ اپنی دینی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں.

۳۔ اپنے ذاتی اور شخصی کاموں کو انجام دینے میں.

۴۔ اپنے مذہب کے خصوصی قوانین و ضوابط میں (جیسے نکاح، طلاق، میراث، وصیت وغیرہ).اس کے علاوہ اگر کسی علاقے میں مذکورہ مذاہب میں سے کسی مذہب کے ماننے والوں کی تعداد زیادہ ہوگی وہاں کے قونصل خانوں میں ان کے لئے ان کے مذہب کے مطابق قوانین و ضوابط وضع کئے جائیں گے اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے حقوق بھی محفوظ رہیں گے. یہاں پر اس موضوع کی مزید وضاحت کے لئے ہم ایران کے بنیادی قانون کی بارہویں اصل کو آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں

'' :ایران کا رسمی دین اسلام اور مذہب جعفری اثنا عشری ہے یہ ہمیشہ رہے گا اور ناقابل تبدیل ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے مذہبوں. جیسے شافعی، حنبلی، حنفی، مالکی، اور زیدی مذاہب کے ماننے والے بھی مکمل طور پر محترم شمار کئے جائیں گے ''

اور ان مذاہب کے پیرو اپنی فقہ کے مطابق اپنے مذہبی رسومات کے انجام دینے میں آزاد ہوں گے اور اسی طرح وہ اپنی دینی تعلیم و تربیت اور اپنے ذاتی مسائل جیسے نکاح ،طلاق ، میراث،وصیت،لڑائی جھگڑوں کے مسائل اور عدالتوں میں مقدموں کے سلسلے میں رسمی طور پر اپنے مذہب کی فقہ پر عمل کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور جس جگہ بھی مذکورہ مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کے پیرو اکثریت میں ہوں گے اس جگہ کے علاقائی قوانین ان کے مذہب کے مطابق ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے حقوق بھی محفوظ ہوں گے ایران کے قانون اساسی کی اس بارہویں اصل کی روشنی میں تمام اسلامی مذاہب کا احترام روشن ہوجاتا ہے ۔

تینتیسواں سوال

کیا شیعہ نماز وتر کو واجب سمجھتے ہیں؟

جواب:نوافل شب میں سے ایک نماز وتر بھی ہے جس کا پڑھنا اسلام کے ماننے والوں اور رسولؐ خدا کی پیروی کرنے والوں کے لئے مستحب ہے لیکن شیعہ فقہاء نے کتاب و سنت کی روشنی میں چند امور کو پیغمبر اسلامؐ کی خصوصیات میں سے قرار دیا ہے ان ہی میں سے ایک حضورؐ پر اس نماز کا واجب ہونا بھی ہے۔ چنانچہ علامہ حلی نے اپنی کتاب ''تذکرۃ الفقہاء'' میں تقریباً ستر چیزوں کو پیغمبر اکرمؐ کی خصوصیات میں شمار کیا ہے اور انہوں نے اپنے کلام کے آغاز ہی میں یہ کہا ہے'':فأمّا الواجبات علیہ دون غیرہ من أمّتہ أمور: الف۔ السواک،ب۔ الوتر، ج۔الأضحیہ، روي عنہؐ أنہ قال :ثلاث کتب عليّ ولم تکتب علیکم : السواک والوتر والأضحیۃ[1]... '' وہ چیزیں جو صرف پیغمبر اسلامؐ پر واجب ہیں اور ان کی امت کے لئے واجب نہیں ہیں وہ یہ ہیں:الف :مسواک کرنا،ب:نماز وتر پڑھنا۔

ج: قربانی کرنا،رسول خدا سے نقل ہوا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایاہے : تین چیزیں میرے اوپر واجب کی گئی ہیں لیکن تم لوگوں پر واجب نہیں ہیں اور وہ ہیں مسواک کرنا ،نماز وتر پڑھنا اور قربانی کرنا ''اس بنیاد پر نماز وتر شیعوں کی نظر میں صرف رسول خداؐ پر واجب ہے اور دوسروں کے لئے اس کا پڑھنا مستحب ہے۔

[1] تذکرۃ الفقہاء جلد۲ کتاب النکاح مقدمہ چہارم۔

چونتیسواں سوال

کیا اولیائے خدا کی غیبی طاقت پر عقیدہ رکھنا شرک ہے؟

جواب: یہ بات واضح ہے کہ جب کبھی کوئی شخص دوسرے سے کسی کام کی درخواست کرتا ہے تو وہ اس شخص کو اس کام کے انجام دینے میں اپنے سے قوی اور طاقتور سمجھتا ہے اور یہ طاقت دو قسم کی ہوتی ہے: ۱۔ کبھی یہ قدرت مادی اور فطری ہوتی ہے جیسے ہم کسی شخص سے کہیں مجھے ایک گلاس پانی لادو.

۲۔ بعض اوقات یہ طاقت مادی اور فطری نہیں ہوتی بلکہ غیبی صورت میں ہوتی ہے جیسے کسی شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ خدا کے کچھ نیک بندے جناب عیسیٰ کی طرح لاعلاج مرض سے شفا عطا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں اور مسیحائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شدید قسم کے مریض کو بھی نجات عطا کرتے ہیں یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کی غیبی طاقتوں پر انہیں خدا کے ارادے اور قدرت کا محتاج سمجھ کر عقیدہ رکھنا فطری و مادی قدرتوں پر عقیدہ رکھنے کی طرح ہے اور یہ ہرگز شرک قرار نہیں پاسکتا اس لئے کہ خداوندعالم ہی نے یہ مادی اور فطری طاقتیں انسان کو عطا کی ہیں اور اسی نے غیبی طاقتوں کو اپنے نیک بندوں کو عنایت فرمایا ہے.

یہاں پر ہم اس جواب کی مزید وضاحت کرنے کے لئے یہ کہیں گے کہ اولیائے خدا کی غیبی قدرت و طاقت پر دو طرح سے عقیدہ رکھا جاسکتا ہے: ۱۔ کسی شخص کی غیبی قدرت پر اس طرح عقیدہ رکھا جائے کہ اسے اپنی اس طاقت میں مستقل اوراصل سمجھیں اور خدائی امور کو مستقل طور پر اس کی طرف نسبت دینے لگیں اس صورت میں شک نہیں کہ یہ عقیدہ شرک شمار ہوگا کیونکہ اس طرح ہم نے غیر خدا کو طاقت میں مستقل سمجھ کر خدائی امور کو غیر خدا کی طرف منسوب کردیا ہے جب کہ یہ طے ہے کہ پروردگار عالم کی لامتناہی طاقت و قدرت ہی سے تمام طاقتوں اور قدرتوں کا سرچشمہ بنا ہے.

۲۔ خدا کے نیک اور باایمان بندوں کی غیبی طاقت پر اس طرح اعتقاد رکھیں کہ انہوں نے اپنی یہ قدرت پروردگار عالم کی لامحدود قدرت سے حاصل کی ہے اور درحقیقت ان قدرتوں کو حاصل کرنے کا سبب یہ ہے کہ ان کے ذریعے خدا کی لامحدود قدرت کا اظہار

کیا جا سکے اور وہ خود اپنی ذات میں کسی طرح کا استقلال نہیں رکھتے ہیں بلکہ وہ اپنی ہستی اور اپنی غیبی قدرت کے استعمال میں پوری طرح ذات پروردگار پر منحصر ہیں.واضح ہے کہ اس طرح کا عقیدہ اولیائے الٰہی کو خدا سمجھنے یا ان کی طرف خدائی امور کی نسبت دینے کی طرح نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں پروردگار عالم کے نیک بندے اس کی اجازت اور ارادے سے اس کی عطا کردہ غیبی طاقت کا اظہار کرتے ہیں. قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:(وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ[1])اور کسی رسول کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی نشانی لے آئے.اس بیان کی روشنی میں واضح ہوجاتا ہے کہ ایسا عقیدہ باعث شرک قرار نہیں پائے گا بلکہ توحید و یکتا پرستی سے مکمل طورپر مطابقت رکھنے والا عقیدہ نظر آئے گا.قرآن مجید کی نظر میں اولیائے الٰہی کی غیبی طاقت مسلمانوں کی آسمانی کتاب نے وضاحت کے ساتھ پروردگار عالم کے ان نیک بندوں کا تذکرہ کیا ہے جنہوں نے پروردگار عالم کی اجازت سے اپنی حیرت انگیز قدرت کا مظاہرہ کیا تھا اس سلسلے میں قرآن مجید کے بعض جملے ملاحظہ ہوں:۱۔ حضرت موسیٰ کی غیبی طاقت خداوند عالم نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اپنے عصا کو پتھر پر ماریں تاکہ اس سے پانی کے چشمے جاری ہوجائیں:(وَإِذْ اسْتَسْقَى مُوسَى لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا[2]) اور اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تو ہم نے کہا : اپنا عصا پتھر پر مارو جس کے نتیجے میں اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے.

حضرت عیسیٰ کی غیبی طاقت قرآن مجید میں مختلف اور متعدد مقامات پر حضرت عیسیٰ کی غیبی قدرت کا تذکرہ ہوا ہے ہم ان میں سے بعض کو یہاں پیش کرتے ہیں: (أَنِّي أَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ[3]) (حضرت عیسیٰ نے فرمایا)میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی شکل کا مجسمہ بناؤں گا اور اس میں پھونک ماروں گا تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ بن جائے گا اور میں پیدائشی اندھے اور برص کے مریض کا علاج کروں گا اور خدا کے حکم سے مردوں کو زندہ کروں گا.حضرت سلیمان کی غیبی طاقت حضرت سلیمان کی غیبی طاقتوں کے سلسلے میں قرآن مجید یہ فرماتا ہے:(وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ

---

[1] سورہ رعد آیت : ۳۸
[2] سورہ بقرہ آیت: ۶۰
[3] سورہ آل عمران آیت : ۴۹

دَاوُودَ وَقَالَ يَاأَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ وَأُوتِينَا مِن كُلِّ شَيْءٍ إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِينُ [1]) اور سلیمان، داؤدؑ کے وارث بنے اور انہوں نے کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی زبان کا علم دیا گیا ہے اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں عنایت کی گئی ہیں بے شک یہ تو ایک نمایاں فضل ہے. اس میں شک نہیں ہے کہ اس قسم کے کام جیسے حضرت موسیٰؑ کا سخت پتھر پر عصا مار کر پانی کے چشمے جاری کردینا حضرت عیسیٰؑ کا گیلی مٹی سے پرندوں کا خلق کردینا اور لاعلاج مریضوں کو شفا عطا کرنا اور مردوں کو زندہ کرنا حضرت سلیمانؑ کا پرندوں کی زبان سمجھنا یہ سب نظام فطرت کے خلاف شمار ہوتے ہیں اور درحقیقت انبیائے الٰہی نے اپنے ان کاموں کو اپنی غیبی طاقتوں کا استعمال کرتے ہوئے انجام دیا ہے. جب قرآن مجید نے اپنی آیات میں بیان کیا ہے کہ خداوند عالم کے نیک بندے غیبی طاقت رکھتے ہیں تو اب کیا ان آیات کے مضامین پر عقیدہ رکھنا شرک یا بدعت شمار کیا جاسکتا ہے؟ ان بیانات کی روشنی میں بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ خدا کے نیک بندوں کی غیبی قدرتوں پر عقیدہ رکھنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انہیں خدا مانا جائے یا ان کی طرف خدائی امور کی نسبت دی جائے اس لئے کہ ان کے بارے میں اس قسم کے عقیدہ سے ان کی خدائی لازم آتی ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ اور حضرت سلیمان وغیرہ قرآن کی نظر میں خدا شمار ہونگے جب کہ سب مسلمان یہ جانتے ہیں کہ کتاب الٰہی کی نگاہ میں اولیائے الٰہی صرف خدا کے نیک بندوں کی حیثیت رکھتے ہیں یہاں تک کی گفتگو سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اولیائے الٰہی کی غیبی طاقت کے سلسلے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ انہیں یہ قدرت پروردگار کی لامحدود قدرت ہی سے حاصل ہوئی ہے اور درحقیقت ان کی اس قدرت کے ذریعے پروردگار عالم کی لامحدود قدرت کا اظہار ہوتا ہے تو اس صورت میں ہمارے یہ عقائد باعث شرک قرار نہیں پائیں گے بلکہ عقیدہ توحید کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ نظر آئیں گے کیونکہ توحید اور یکتا پرستی کا معیار یہ ہے کہ ہم دنیا کی تمام قدرتوں کو خدا کی طرف پلٹائیں اور اسی کی ذات کو تمام قدرتوں اور جنبشوں کا سرچشمہ قرار دیں ۔

[1] سورہ نمل آیت :۱۶

پینتیسواں سوال

کیوں منصب امامت منصب رسالت سے افضل ہے؟

جواب:اس سوال کے جواب کے لئے سب سے پہلے ہم قرآن و حدیث کی روشنی میں ان تین لفظوں نبوت، رسالت اور امامت کی وضاحت پیش کریں گے تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ منصب امامت ان دو منصبوں سے افضل ہے۔ا۔ منصب نبوت لفظ نبی کو ''نبأ'' سے اخذ کیا گیا ہے جس سے مراد ''اہم خبر'' ہے اس اعتبار سے نبی کے لغوی معنی ہیں وہ شخص جس کے پاس کوئی اہم خبر ہو یا وہ اس خبر کو پہنچانے والا ہو![1] قرآن کی اصطلاح میں بھی ''نبی'' ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو خداوندعالم سے مختلف طریقوں سے وحی حاصل کرتا ہو اور کسی بشر کے واسطے کے بغیر خدا کی طرف سے خبر دیتا ہو علماء نے نبی کی یہ تعریف کی ہے:اِنّہ مؤدٍ من اللہ بلاواسطۃ من البشر[2]نبی ایسا شخص ہے جو کسی بشر کے واسطے کے بغیر خدا کی طرف سے پیغام پہنچاتا ہے اس بنیاد پر ''نبی'' کا کام صرف یہ ہے کہ پروردگار عالم سے وحی حاصل کرے اور اس پر جو الہام ہوا ہے اسے لوگوں تک پہنچادے اور بس. قرآن مجید اس سلسلے میں یہ فرماتا ہے: (فبعث اللہ النبیّین مبشرین و منذرین[3]) پھر اللہ نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے انبیاء بھیجے.

۲۔ منصب رسالت وحی الٰہی کی اصطلاح میں رسول ان پیغمبروں کو کہا جاتا ہے جو خدا سے وحی لینے اور اسے لوگوں تک پہنچانے کے علاوہ خدا کی طرف سے اس کی شریعت کو بیان کرنے اور اپنی رسالت کے اعلان کرنے کی اجازت بھی رکھتے ہوں قرآن مجید اس سلسلے میں یہ فرماتا ہے: (فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ[4]) پھر اگر تم نے منہ پھیر لیا تو جان لو ہمارے رسول کی ذمہ داری تو بس واضح طور پر حکم پہنچادینا ہے.لہذا منصب رسالت ایک ایسا منصب ہے جو نبی کو عطا کیا جاتا ہے دوسرے لفظوں میں

[1] اگر نبی صیغۂ لازم ہو گا تو پہلے معنی میں ہوگا اور اگر متعدی ہوگا تو دوسرے معنی میں ہوگا.
[2] رسائل العشر (مصنفہ شیخ طوسیؒ)ص ۱۱۱.
[3] سورہ بقرہ آیت: ۲۱۳.
[4] سورہ مائدہ آیت ۹۲.

نبوت اور رسالت دونوں ہی الفاظ اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو پیغمبروں میں پائی جاتی ہے اگر پیغمبر صرف وحی الہی کو لے کر پہنچا دے تو اسے نبی کہتے ہیں لیکن اگر وہ رسالت و شریعت بھی لوگوں تک پہنچائے تو اسے رسول کہا جاتا ہے.

۳۔ منصب امامت قرآن مجید کی نظر میں منصب امامت، نبوت او رسالت کے علاوہ ایک تیسرا عہد ہ ہے جس میں صاحب منصب کو لوگوں کی رہبری کے ساتھ ساتھ کچھ زیادہ تصرفات کا اختیار حاصل ہوتا ہے.اب ہم قرآنی آیات کی روشنی میں اس موضوع کے بارے میں چند واضح دلائل پیش کرتے ہیں. ا۔ قرآن کریم حضرت ابراہیم خلیل کو منصب امامت عطا کرتے ہوئے فرماتا ہے: (وَإِذْ ابْتَلَى إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي[1])اور (وہ وقت یاد کیجئے) جب ابراہیم کو ان کے رب نے چند کلمات کے ذریعہ آزمایا اور انہوں نے ان کو پورا کر دکھایا تو ارشاد ہوا میں تمہیں لوگوں کا امام بنا رہا ہوں انہوں نے کہا اور میری ذریت ؟

قرآن مجید کی اس آیت سے دو حقیقتیں آشکار ہوجاتی ہیں: الف: مذکورہ آیت بخوبی اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ منصب امامت، نبوت و رسالت کے علاوہ ایک تیسرا منصب ہے کیونکہ حضرت ابراہیم ان آزمائشوں (منجملہ قربانی اسماعیل سے پہلے ہی) مقام نبوت پر فائز تھے یہ بات درج ذیل دلیل سے ثابت ہوتی ہے: ہم سب یہ جانتے ہیں کہ خداوندعالم نے حضرت ابراہیم کو بڑھاپے میں حضرت اسماعیل و اسحاق عطا فرمائے تھے قرآن مجید حضرت ابراہیم کی زبان سے یوں حکایت کرتا ہے: (الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ[2]) شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل و اسحق عطا کئے۔

اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم کی مذکورہ آزمائشوں میں سے ایک حضرت اسماعیل کی قربانی بھی تھی اور اس مشکل آزمائش کے مقابلے میں انہیں منصب امامت عطا کیا گیا تھا نیز انہیں یہ منصب ان کی عمر کے آخری حصے میں عطا کیا گیا تھا.جبکہ وہ کئی

[1] سورہ بقرہ آیت : ۱۲۴.
[2] سورہ ابراہیم آیت :۳۹.

سال پہلے ہی سے منصب نبوت پر فائز تھے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ پر ان کی ذریت سے پہلے بھی وحی الہی (جو کہ نبوت کی نشانی ہے) نازل ہوا کرتی تھی[1]۔

ب:اسی طرح اس آیت (وَإِذْ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ...) سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امامت اور رہبری کا منصب نبوت و رسالت سے بالاتر ہے کیونکہ قرآن مجید کی گواہی کے مطابق خداوند کریم نے جناب ابراہیمؑ کو نبوت و رسالت کے عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود جب انہیں امامت عطا کرنی چاہی تو انتہائی سخت قسم کے امتحان سے آزمایا تھا اور جب وہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے تب اس کے بعد یہ منصب انہیں دیا تھا اس بات کی دلیل واضح ہے اس لئے کہ امامت کے فرائض میں وحی الہی کے حاصل کرنے اور رسالت و شریعت کے پہنچانے والے کے علاوہ امت کی رہبری اور ان کی ہدایت کرتے ہوئے انہیں کمال و سعادت کی راہ پر گامزن کرنا بھی شامل ہے اب یہ بات فطری ہے کہ وہ منصب ایک خاص قسم کی عزت و عظمت کا حامل ہوگا جس کا حصول انتہائی سخت آزمائشوں کے بغیر ممکن ہی نہ ہو .

۲۔گذشتہ آیت سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ خداوند عالم نے سخت آزمائشوں کے بعد جناب ابراہیمؑ کو امامت اور معاشرہ کی قیادت عطا فرمائی تھی اور اس وقت جناب ابراہیمؑ نے خدا سے درخواست کی تھی خدایا! اس منصب کو میری ذریت میں بھی قرار دینا اب قرآن مجید کی چند دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار عالم نے جناب ابراہیمؑ کی یہ درخواست قبول کرلی تھی اور نبوت و امامت کے بعد امت کی رہبری اور حکومت کو جناب ابراہیمؑ کی نیک اور صالح ذریت میں بھی قرار دے دیا تھا. قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے: (فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا[2]) تو پھر ہم نے آل ابراہیم کو کتاب و حکمت عطا کی اور انکو عظیم سلطنت عنایت کی.اس آیت سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ ''امامت'' نبوت ،سے الگ ایک منصب ہے جسے خداوند عالم نے اپنے عظیم القدر نبی جناب ابراہیمؑ کو سخت آزمائشوں کے بعد عطا فرمایا تھا اور انہوں نے اس وقت خداوند عالم سے درخواست

---

[1] اس سلسلے میں سورہ صافات کی آیت نمبر۹۹ سے لے کر ۱۰۲ تک اور سورہ حجر کی آیت نمبر۵۳اور ۵۴ اور سورہ ہود کی آیت ۷۰ اور ۷۱ کا مطالعہ فرمائیں.

[2] سورہ نساء آیت ۵۴.

کی تھی کہ امامت کو میری ذریت میں بھی قرار دے تو خدائے حکیم نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی تھی اور انہیں آسمانی کتاب اور حکمت (جو کہ نبوت و رسالت سے مخصوص ہے) کے علاوہ ''ملک عظیم'' (یعنی لوگوں پر حکومت) بھی عطا کی تھی. لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ خداوند کریم نے جناب ابراہیمؑ کی ذریت کے بعض افراد (جیسے حضرت یوسفؑ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ) کو منصب نبوت کے علاوہ حکومت کرنے اور لوگوں کی رہبری کے لئے بھی منتخب فرمایا تھا ان بیانات کی روشنی میں معلوم ہوجاتا ہے کہ امامت کا عہدہ نبوت و رسالت کے علاوہ ایک تیسرا منصب ہے جو کہ مزید قدرت اور ذمہ داریوں کی وجہ سے دوسرے عہدوں کی بہ نسبت زیادہ اہمیت کا حامل ہے.

منصب امامت کی برتری

گذشتہ بیانات سے واضح ہوجاتا ہے کہ نبی اور رسول کا کام صرف لوگوں تک پیغام پہنچانا اور انہیں راہ دکھانا ہے اور اگر کوئی نبی منصب امامت پر فائز ہوجاتا ہے تو اس کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے اور نتیجے میں معاشرے کو سنوارنے اور سعادت مند بنانے کے لئے شریعت کے احکامات کو نافذ کرنے کی ذمہ داری بھی اس کے دوش پر آجاتی ہے اس طرح وہ امت کو ایسے راستے پر گامزن کردیتا ہے جس سے وہ دونوں جہان میں خوشبخت بن جاتی ہے. واضح ہے کہ اس قسم کی اہم ذمہ داری ایک عظیم معنوی قدرت او ر خاص لیاقت کی نیاز مند ہے اور اس سنگین عہدے کے لئے راہ خدا میں صبر اور ثبات قدم کی ضرورت ہے کیونکہ اس راہ میں ہمیشہ سخت مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے خواہشات نفسانی سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ عشق خدا اور رضائے پروردگار کے بغیر اس عظیم منصب کا حصول ممکن نہیں ہے ان ہی سب وجہوں سے خداوند عظیم نے جناب ابراہیمؑ کو ان کی عمر کے آخری حصے میں انتہائی سخت آزمائشوں کے بعد یہ منصب عطا کیا تھا اور پھر اپنے بہترین بندوں جیسے حضرت پیغمبر ختمی مرتبت [ص]کو یہ منصب امامت و رہبری عنایت فرمایا تھا.کیا نبوت اور امامت ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم ہیں؟اس سوال سے ایک اور سوال بھی سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ : کیا ہر نبی کے لئے امام ہونا اور ہر امام کے لئے نبی ہونا ضروری ہے؟ان دو سوالوں کا جواب

منفی ہے ہم اس جواب کو واضح کرنے کیلئے وحی الہی کا سہارا لیں گے وہ آیتیں جو طالوت اور ظالم جالوت کی جنگ کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں اس بات کو بیان کرتی ہیں کہ خداوند عالم نے حضرت موسیٰ کے بعد منصب نبوت کو بظاہر ''اشموئیل'' نامی شخص کو عطا فرمایا تھا اور ساتھ ہی ساتھ منصب امامت و حکومت کو جناب طالوتؑ کے سپرد کیا تھا اس قصے کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے: حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے اپنے زمانے کے پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک حکمران معین کیجئے تاکہ اس کی سربراہی میں ہم راہ خدا میں جنگ کریں تو اس وقت ان کے پیغمبر نے ان سے یوں کہا: (وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوَاْ أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ وَاللّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ[1]) اور ان کے پیغمبر نے ان سے کہا: اللہ نے طالوت کو تمہارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ ان لوگوں نے کہا: اسے ہم پر بادشاہی کرنے کا حق کیسے مل گیا ہے؟ ہم خود بادشاہی کے اس سے زیادہ حق دار ہیں۔ وہ تو کوئی دولت مند آدمی نہیں ہے ۔

نبی نے جواب دیا کہ اللہ نے اسے تمہارے لئے منتخب کیا ہے اور اسے علم اور جسمانی طاقت کی فراوانی سے نوازا ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنا ملک دے دیتا ہے اور اللہ بڑا وسعت والا، دانا ہے۔ اس آیت سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں: ۱۔ یہ ممکن ہے کہ کچھ مصلحتیں اس بات کا تقاضا کریں کہ منصب نبوت کو منصب امامت سے جدا کردیا جائے اور ایک ہی زمانے میں دو الگ الگ افراد نبی و امام ہوں اور ان میں سے ہر ایک اپنے خاص منصب ہی کی لیاقت و صلاحیت رکھتا ہو۔

اسی لئے بنی اسرائیل نے اپنے زمانے میں ان دو منصبوں کے جدا ہونے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا کہ اے پیغمبر آپ طالوت سے زیادہ حکومت کے حقدار ہیں بلکہ انہوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ ہم اس سے زیادہ حکومت کے حقدار ہیں۔

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۲۴۷.

۲۔جناب طالوتؑ کو حکومت خداوند کریم ہی نے عطا کی تھی قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے: (إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا)اللہ نے طالوت کو تمہارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے اور یہ بھی ارشاد ہوتا ہے(إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ) بے شک اللہ نے اسے تمہارے لئے منتخب کیا ہے .

۳۔جناب طالوت کا یہ الہی منصب صرف فوج کی سربراہی تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ بنی اسرائیل کے حاکم و فرمانروا بھی تھے کیونکہ قرآن نے انہیں ''مَلِكًا'' کہہ کر یاد کیا ہے اگرچہ اس دن اس رہبری کا مقصد یہ تھا کہ جہاد کرنے کے لئے بنی اسرائیل کی سربراہی کریں لیکن ان کا یہ الہی منصب انہیں دوسری حکومتی ذمہ داریوں کو بھی انجام دینے کی اجازت دیتا تھا. اس لئے قرآن مجید اس آیت کے اختتام میں فرماتا ہے: (وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ) اور اللہ جسے چاہے اپنا ملک دیدے.

۴۔امت کی رہبری اور امامت کے لئے اہم ترین شرط یہ ہے کہ اس میں علمی، جسمانی،اور معنوی توانائی پائی جاتی ہو اس قسم کی صلاحیت اس زمانے میں زیادہ اہمیت رکھتی تھی کیونکہ ان ایام میں حاکم خود میدان میں حاضر ہو کر جنگ کرتا تھا گذشتہ بیانات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نبوت اور امامت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم نہیں ہیں بلکہ ممکن ہے کہ ایک شخص نبی تو ہو لیکن منصب امامت پر فائز نہ ہو یا یہ کہ کوئی شخص خدا کی جانب سے امام تو ہو لیکن اسے عہدۂ نبوت حاصل نہ ہوا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ پروردگارعالم یہ دونوں منصب ایک ہی شخص کو عطا کردے جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:(فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ[۲]) چنانچہ اللہ کے اذن سے انہوں نے جالوت کے لشکر کو شکست دے دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کردیا اور اللہ نے انہیں سلطنت و حکمت عطا فرمائی اور جو کچھ چاہا انہیں سکھادیا.

---

[۱] منشور جاوید (مصنفہ استاد جعفرسبحانی) سے ماخوذ.
[۲] سورہ بقرہ آیت ۲۵۱.

چھبیسواں سوال

توحید اور شرک کی شناخت کا معیار کیا ہے؟

''توحید'' اور شرک کی بحثوں میں سب سے اہم مسئلہ ان دونوں کی شناخت کے معیار کا ہے اور جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا بعض دوسرے اہم مسائل بھی حل نہیں ہوپائیں گے اس لئے ہم مسئلہ توحید و شرک پر مختلف زاویوں سے مختصراً بحث پیش کررہے ہیں: ا۔توحید ذاتی توحید ذاتی دو صورتوں میں پیش کی جاتی ہے: الف:خدا ایک ہے اور کوئی اس جیسا نہیں (اس مفہوم کو علم کلام کے علماء واجب الوجود کے نام سے یاد کرتے ہیں) اور یہ وہی توحید ہے کہ جسے خداوند عالم نے مختلف صورتوں میں قرآن مجید میں ذکر فرمایا ہے ملاحظہ ہو:(لیس کمثلہ شيء) اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے[1]ایک اور جگہ پر فرماتا ہے:(ولم یکن لہ کفواً أحد [2])اور کوئی بھی اس کا کفو اور ہمسر نہیں ہے.البتہ بعض اوقات توحید کی اس قسم کی تفسیر عامیانہ طور پر کردی جاتی ہے کہ جس میں توحید عددی کا رنگ دکھائی دینے لگتا ہے وہ اس طرح کہ : کہا جاتا ہے کہ خدا ایک ہے اور دو نہیں اس قسم کا جملہ سن کر کچھ کہے بغیر واضح ہوجاتا ہے کہ خدا کی طرف اس قسم کی توحید (عددی) کی نسبت دینا صحیح نہیں ہے.ب: خدا کی ذات بسیط ہے نہ کہ مرکب کیونکہ ہرمرکب موجود (چاہے اس کا وجودذہنی اجزاء سے مرکب ہو یا خارجی اجزاء سے مرکب ہو) اپنے وجود میں اجزاء کا محتاج ہوتا ہے اور محتاج ہونا ممکن ہونے کی علامت ہے اور ہر ممکن علت کا محتاج ہوتا ہے.اور یہ سب کچھ واجب الوجود کے ساتھ کسی بھی صورت میں مطابقت نہیں رکھتا.

٢۔ خالقیت میں توحید :توحید کے وہ مراتب جنہیں عقل و نقل دونوں نے قبول کیا ہے ان میں سے ایک توحید خالقیت بھی ہے عقل کی روسے خداوندعالم کے علاوہ جوکچھ بھی ہے وہ سب عالم امکان کے زمرے میں آتا ہے اور ہر قسم کے جمال وکمال سے

[1] سورہ شوریٰ آیت: ١١.
[2] سورہ اخلاص آیت:۴.

عاری ہوتا ہے اور جو کچھ عالم امکان میں پایا جاتا ہے وہ غنی بالذات (خدا) کی بے کراں رحمتسے فیض یاب ہوتا ہے اس اعتبار سے اس دنیا میں دکھائی دینے والے جمال وکمال کے جلوے اسی کے مرہون منت ہوتے ہیں قرآن مجید نے بھی توحید خالقیت کے سلسلے میں بہت سی آیات پیش کی ہیں ہم ان میں سے صرف ایک آیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں:(قُلِ اللہُ خَالِقُ کُلِّ شَيْءٍ وَہُوَ الْوَاحِدُ الْقَہَّارُ [1]) کہہ دیجئے : ہرچیز کا خالق صرف اللہ ہے اور وہ یکتا ،بڑا غالب ہے.

لہذا خدا پرستوں میں مجموعی طور پر توحید خالقیت کے سلسلے میں اختلاف نہیں پایا جاتا ہے صرف اتنا فرق ہے کہ توحید خالقیت کے بارے میں دو قسم کی تفسیریں پائی جاتی ہیں ان دونوں کو ہم یہاں بیان کرتے ہیں:الف:موجودات عالم میں پائے جانے والے ہر قسم کی علت اور معلول والے نظام اور نیز ان کے درمیان پائے جانے والے سبب اور مسبب کے رابطے سب ہی علۃ العلل (جس کی کوئی علت نہ ہو)اور مسبب الاسباب(جس کا کوئی سبب نہ ہو) تک پہنچتے ہیں اور درحقیقت اصلی اور مستقل خالق خداوندعالم ہی کی ذات ہے اور خدا کے علاوہ باقی سب علل واسباب، خداوندعالم کی اجازت و مشیت کے تابع ہیں.اس نظریہ میں دنیا میں علت و معلول کے نظام کا اعتراف کیا گیا ہے .اور علم بشر نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے لیکن اس کے باوجود کل نظام کا تعلق ایک لحاظ سے خدا ہی سے ہے اور اسی نے اسباب کو سببیت، علت کو علیت اور موثر کو تاثیر عطا کی ہے.

ب:اس دنیا میں صرف ایک ہی خالق کا وجود ہے اور وہ خداوندعالم کی ذات ہے اور نظام ہستی میں اشیاء کے درمیان ایک دوسرے کیلئے کسی قسم کی اثر گزاری اور اثرپذیری نہیں پائی جاتی بلکہ تمام مادی موجودات کا خالق بلا واسطہ خدا ہی ہے .اسی طرح انسان کی طاقت بھی اس کے اعمال پر اثر انداز نہیں ہوتی ہے . لہذا نظام ہستی میں صرف ایک ہی علت پائی جاتی ہے اور وہی ان فطری علتوں کی رئیس و اصل ہے. البتہ توحید خالقیت کی یہ تفسیر اشاعرہ نے پیش کی ہے لیکن ان میں سے بعض افراد جیسے امام الحرمین [2] اور شیخ محمد عبدہ نے رسالہ توحید میں اس تفسیر کو چھوڑ کر پہلی تفسیر کو مانا ہے.

---

[1] سورہ رعد آیت: ۱۶.
[2] ملل و نحل(شہرستانی)جلد١.

۳۔تدبیر میں توحید چونکہ عالم کو خلق کرنا خدا ہی سے مخصوص ہے لہذا نظام ہستی کی تدبیر بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور اس دنیا میں صرف ایک ہی مدبر کا وجود ہے اور وہ عقلی دلیل کہ جو توحید خالقیت کو ثابت کرتی ہے وہی دلیل تدبیر میں بھی توحید کو ثابت کرتی ہے. قرآن مجید کی متعدد آیات نے خداوند عالم کے مدبر ہونے کو بیان کیا ہے اس سلسلے میں یہ آیت ملاحظہ ہو: (أَغَيْرَ اللهِ أَبْغِي رَبّا وَہُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ[1]) کہہ دیجئے: کہ کیا میں خدا کے علاوہ کوئی اور رب تلاش کروں جب کہ وہ ہر چیز کا رب ہے.

البتہ وہ دونوں تفسیریں جو توحید خالقیت میں پائی جاتی ہیں وہی توحید تدبیری میں بھی پائی جاتی ہیں اور ہمارے عقیدے کے مطابق توحید تدبیری سے مراد یہ ہے کہ مستقل طور پر تدبیر کرنا صرف خدا سے مخصوص ہے اس بنیاد پر نظام ہستی کے موجودات کے درمیان بعض تدبیریں خدا کے ارادے اور مشیت سے وجود میں آتی ہیں قرآن مجید نے بھی حق سے متمسک مدبروں کے بارے میں یوں فرمایا ہے: (فالمدبرات امرا[2]) پھر امر کی تدبیر کرنے والے ہیں.

۴۔حاکمیت میں توحید حاکمیت میں توحید سے مراد یہ ہے کہ حکومت کا حق فقط خداوند عالم کو ہے اور صرف وہی انسانوں پر حاکم ہے جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے.: (اِنِ الْحُکْمُ اِلا للهِ[3]) حکم کرنے کا حق صرف خدا کو ہے.اس اعتبار سے خدا کے علاوہ کسی اور کی حکومت صرف خدا کے ارادے اور مشیت سے ہونی چاہیے تاکہ نیک اور صالح افراد ہی معاشرے کے امور کی باگ ڈور سنبھالیں اور لوگوں کو کمال و سعادت کی راہ پر گامزن کر سکیں جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے: (يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ[4]) اے داؤد ہم نے آپ کو زمین پر اپنا جانشین بنایا ہے لہذا آپ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کریں.

۵۔اطاعت میں توحید اطاعت میں توحید سے مراد یہ ہے کہ حقیقی اور ذاتی طور پر خدائے بزرگ کی پیروی ضروری ہے لہذا بعض دوسرے افراد (جیسے پیغمبر، امام، فقیہ، باپ اور ماں) کی اطاعت کا لازم ہونا پروردگار عالم کے حکم اور ارادے سے ہے .

---

[1] سورہ انعام آیت:۱۶۴.
[2] سورہ نازعات آیت :۵
[3] سورہ یوسف آیت :۴۰.
[4] سورہ ص آیت۲۶.

٦۔ شریعت قرار دینے اور قانون گزاری میں توحید قانون گزاری میں توحید سے مراد یہ ہے کہ شریعت قرار دینے اور قانون گزاری کا حق فقط خداوند عالم کو ہے اسی بنیاد پر قرآن مجید ہر اس حکم کو جو حکم الہی کے دائرے سے خارج ہو اسے کفر، فسق اور ظلم کا سبب قرار دیتا ہے ملاحظہ ہو: (وَمَن لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ[1]) اور جو لوگ بھی خدا کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ ظالم ہیں.(وَمَن لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ[2]) اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ فاسق ہیں.(وَمَن لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ[3]) اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ ظالم ہیں.

۷۔ عبادت میں توحید عبادت میں توحید کے سلسلے میں اہم ترین بحث ''عبادت'' کے معنی کی شناخت ہے کیونکہ سب مسلمان اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ عبادت صرف خدا سے مخصوص ہے اوراس کے علاوہ کسی اور کی پرستش نہ کی جائے جیسا کہ قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے: (إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ[4]) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں.

قرآن مجید کی مختلف آیات سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کی دعوتوں کا بنیادی عنصر یہی عقیدہ تھا قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے: (وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولاً أَنِ اعْبُدُوا اللهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ[5]) اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا تاکہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی بندگی سے اجتناب کرو.لہذا اس مسلم الثبوت اصل میں کوئی شک نہیں کہ عبادت کا حق صرف خدا کا ہے اور اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کی جا سکتی نیز یہ کہ اس اصل پر ایمان نہ رکھنے والا موحد نہیں ہوسکتا.

لیکن ہماری گفتگو اس سلسلے میں ہے کہ ''عبادت'' اور غیر عبادت کی شناخت کا معیار کیا ہے؟مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے استاد اور ماں باپ یا علماء اور مجتہدین کے ہاتھوں کا بوسہ لے یا اپنے ذوی الحقوق کا احترام کرے تو کیا اس کا یہ عمل ان کی عبادت شمار ہوگا؟ یا ایسا نہیں ہے بلکہ کسی کے مقابلے میں خضوع و خشوع کو عبادت نہیں کہتے.بلکہ عبادت کے لئے ایک خاص صفت کا ہونا

[1] سورہ مائدہ آیت:۴۴.
[2] سورہ مائدہ آیت:۴۷.
[3] سورہ مائدہ آیت ۴۵.
[4] سورہ حمد آیت: ۴.
[5] سورہ نحل آیت:۳۶.

ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر چاہے جس بھی طرح کا خضوع ہو عبادت نہیں کہلائے گا اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کونسی بنیادی صفت ہے جو کسی بھی طرح کے خضوع کو عبادت بنا سکتی ہے؟لفظ عبادت کے غلط معنی کچھ مصنفین نے اپنی کتابوں میں عبادت کے معنی خضوع اور یا زیادہ خضوع بیان کئے ہیں لیکن ان مصنفین کو قرآن مجید کی بعض آیات کے ترجمہ میں مشکل پیش آتی ہے کیونکہ ان آیتوں میں خداوند کریم نے صراحت سے یہ بیان کیا ہے کہ اس نے فرشتوں کو جناب آدمؑ کا سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا ملاحظہ ہو: (وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ [1]) اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو.

حضرت آدمؑ کے لئے بعینہ اسی طرح سجدہ بجالایا گیا جس طرح خداوند کریم کے لئے سجدہ کیا جاتا تھا جبکہ جناب آدمؑ کے سامنے یہ سجدہ خضوع اور تواضع کے اظہار کی خاطر انجام پایا تھا اور خدا کا سجدہ عبادت و پرستش کے طور پر بجالایا جاتا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ ایک ہی طرح کے سجدوں میں کیسے دو مختلف حقیقتیں پیدا ہوگئیں؟قرآن مجید ایک اور جگہ فرماتا ہے کہ جناب یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کے ہمراہ جناب یوسفؑ کے سامنے سجدہ کیا تھا: (وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا وَقَالَ يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا [2]) اور یوسف نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور وہ سب انکے سامنے سجدے میں گر پڑے اور یوسفؑ نے کہا: اے باباجان! یہی میرے پہلے خواب کی تعبیر ہے بے شک میرے رب نے اسے سچ کردکھایا ہے،یہاں پر اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ جناب یوسفؑ نے پہلے خواب کی طرف اشارہ کیا تھا جس سے مراد وہی خواب تھا جس میں انہوں نے دیکھا تھا کہ چاند اور سورج کے ہمراہ گیارہ ستارے ان کے سامنے سجدہ ریز ہیں اس بات کو قرآن مجید نے یوں نقل کیا ہے: (إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ [3]) میں نے خواب میں گیارہ ستاروں اور آفتاب و مہتاب کو دیکھا ہے کہ یہ میرے سامنے سجدہ کررہے ہیں،اس آیت میں گیارہ ستاروں سے جناب یوسفؑ کے گیارہ بھائی اور چاند اور سورج سے ان کے ماں اور باپ مراد ہیں. اس بیان سے واضح ہوجاتا ہے کہ نہ صرف حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں نے بلکہ خود جناب یعقوبؑ نے بھی جناب یوسفؑ کے سامنے

---

[1] سورہ بقرہ آیت:۳۴.
[2] سورہ یوسف آیت:۱۰۰.
[3] سورہ یوسف آیت :۴.

سجدہ کیا تھا.اب یہاں ہم یہ سوال کرنا چاہتے ہیں: اس قسم کے سجدہ کو عبادت میں شمار کیوں نہیں کیا جاتا جبکہ سجدہ نہایت خضوع اور تواضع کے ساتھ بجالایا گیا تھا؟عذر بدتراز گناہ یہاں پر چونکہ مذکورہ مصنفین اس سوال کا جواب نہیں دے پائے لہذا یوں کہتے ہیں: چونکہ اس قسم کا خضوع و خشوع پروردگارعالم کے حکم سے انجام دیا گیا تھا لہذا اسے شرک شمار نہیں کیا جاسکتا.لیکن یہ بات معلوم ہے کہ ان کی یہ تاویل کسی بھی اعتبار سے صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اگر کوئی عمل باعث شرک ہو تو خداوندعالم ہرگز اس کا حکم نہیں دے سکتا.قرآن مجید فرماتا ہے: (قُلْ إِنَّ اللّہَ لاَيَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللّہِ مَا لاَتَعْلَمُونَ[1]) کہہ دیجئے اللہ یقیناً برائی کا حکم نہیں دیتا .کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہو جن کا تمہیں علم ہی نہیں؟اصولی طور پر خداوندعالم کا حکم کسی چیز کی حقیقت کو نہیں بدلتا اگر ایک انسان کے مقابلے میں خضوع کرنا اس کی عبادت ہو اور خدائے بزرگ نیز اس کا حکم دے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا اپنی عبادت کا حکم دے رہا ہے.مسئلے کا جواب اور عبادت کے حقیقی معنی کی وضاحت یہاں تک یہ واضح ہوگیا کہ ''غیر خدا کی عبادت کے ممنوع ہونے کے سلسلے میں'' دنیا کے تمام موحد متفق ہیں اور دوسری طرف سے یہ بھی روشن ہوچکا ہے کہ فرشتوں کا حضرت آدمؑ کے سامنے اور حضرت یعقوبؑ اور ان کے بیٹوں کا حضرت یوسفؑ کے سامنے سجدہ کرنا ان کی عبادت نہ تھا اب ضروری ہے کہ ہم اس نکتے کی طرف توجہ دلائیں کہ وہ کون سی خاص صفت ہے جس کے نہ ہونے سے ایک عمل عبادت نہیں بن پاتا جبکہ اگر وہ پائی جاتی ہو تو وہی عمل عبادت شمار ہوتاہے.قرآنی آیات کی روشنی میں واضح ہوجاتا ہے کہ کسی موجود کو خدا سمجھ کر اس کے سامنے خضوع کرنا یا اس کی طرف خدائی امور کی نسبت دینا اس کی عبادت کہلاتا ہے اس بیان سے بخوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ اگر کسی کو خدائی امور انجام دینے پر قادر سمجھتے ہوئے اس کے سامنے خضوع کیا جائے تو یہ عمل اسی کی عبادت شمار ہوگا .دنیا کے مشرک ایسے موجودات کے سامنے خضوع کیا کرتے تھے کہ جنہیں وہ مخلوق خدا تو سمجھتے تھے لیکن وہ اس بات کے معتقد تھے کہ کچھ خدائی امور جیسے کہ گناہوں کی بخشش، اور حق شفاعت انہیں موجودات کو سونپ دیئے گئے ہیں.

---

[1] سورہ اعراف آیت:٢٨.

سرزمین بابل کے کچھ مشرک آسمانی ستاروں کو اپنا رب اور دنیا اور انسانوں کی تدبیر کا مالک سمجھ کر ان کی عبادت کرتے تھے لیکن انہیں اپنا خالق نہیں سمجھتے تھے حضرت ابراہیمؑ نے بھی اسی اصل کی بنا پر اپنی قوم کے ساتھ مناظرہ کیا تھا کیونکہ سرزمین بابل کے مشرک ہرگز سورج چاند اور ستاروں کو اپنا خالق نہیں سمجھتے تھے.بلکہ وہ انہیں ایسی باقدرت مخلوق سمجھتے تھے جنہیں ربوبیت اور دنیا کی تدبیر سونپ دی گئی تھی قرآنی آیات میں بھی حضرت ابراہیمؑ اور مشرکین بابل کے درمیان مناظرے میں لفظ رب کو محور قرار دیتے ہوئے بیان کیا گیا ہے اور یہ واضح ہے کہ لفظ رب کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو اپنا صاحب اور اپنی مملوک کے امور کا مدبر قرار دیا جائے .عربی زبان میں گھر کے مالک کو "رب البیت" اور کھیتی باڑی کے مالک کو رب الضیعہ کہتے ہیں اس لئے کہ گھر اور کھیتی باڑی کی تدبیر ان کے مالکوں کے ذمے ہوتی ہے. قرآن مجید مشرکین کے مقابلے میں صرف خداوندعالم کو اس نظام ہستی کا رب اور مدبر قرار دیتا ہے اور سب کو خدائے یگانہ کی پرستش کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے:(إِنَّ اللّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ[٢]) اللہ میرا رب اور تمہارا بھی رب ہے لہذا اس کی عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے.ایک اور جگہ فرماتا ہے:(ذَلِكُمُ اللّهُ رَبُّكُمْ لا إِلَـهَ إِلاَّ هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ[٣]) وہی اللہ تمہارا پروردگار ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں وہ ہر چیز کا خالق ہے لہذا اس کی عبادت کرو.اس طرح قرآن مجید سورۂ دخان میں فرماتا ہے:(لَاإِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَاءِكُمُ الْأَوَّلِين[٤]) اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی زندگی اور موت دیتا ہے وہی تمہارا رب ہے اور تمہارے پہلے آباؤ اجداد کا بھی رب ہے.

اسی طرح قرآن مجید نے حضرت عیسیؑ کے قول کو یوں نقل کیا ہے:(وَقَالَ الْمَسِيحُ يَابَنِي إِسْرَاءِيلَ اعْبُدُوا اللّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ[٥]) اور مسیح نے کہا :اے بنی اسرائیل تم اللہ ہی کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے.گذشتہ بیانات کی روشنی میں واضح ہوجاتا ہے کہ ہروہ خضوع جو کسی مخلوق کے سامنے اسے رب اور خدا سمجھے بغیر یا اس کی طرف خدائی امور کی نسبت دئیے بغیر انجام دیا جائے وہ ہرگز

---

[١] سورہ انعام آیت ٧٦ تا ٧٨.
[٢] سورہ آل عمران آیت ٥١.
[٣] سورہ انعام آیت: ١٠٢.
[٤] سورہ دخان آیت٨
[٥] سورہ مائدہ آیت:٧٢.

عبادت شمار نہیں کیا جاسکتا اگرچہ یہ خضوع حد سے زیادہ ہی کیوں نہ ہوجائے اس اعتبار سے امت کا پیغمبر اکرمؐ یا اپنے والدین کے سامنے انہیں خدا قرار نہ دیتے ہوئے خضوع وخشوع کرنا ہرگز ان کی عبادت شمار نہیں کیا جاسکتا . اسی بنیاد پر بہت سے موضوعات جیسے اولیائے الہی سے منسوب چیزوں کو متبرک سمجھنا ،حرم کے دروازوں، دیواروں اور ضریحوں کو چومنا، خدا کی بارگاہ میں اولیائے الہی سے متوسل ہونا، اولیائے الہی کو پکارنا، ان کے ایام ولادت میں جشن منانا اور محفلیں برپا کرنا اور ان کے ایام وفات و شہادت میں مجلسیں منعقد کرنا ہرگز اولیائے الہی کی عبادت شمار نہیں کیا جاسکتا اگرچہ بعض ناآگاہ افراد ان کاموں کو غیر خدا کی عبادت اور شرک سمجھتے ہیں جبکہ ان سارے کاموں کو کسی بھی طرح سے غیر خدا کی عبادت اور شرک شمار نہیں کیا جاسکتا ہے۔